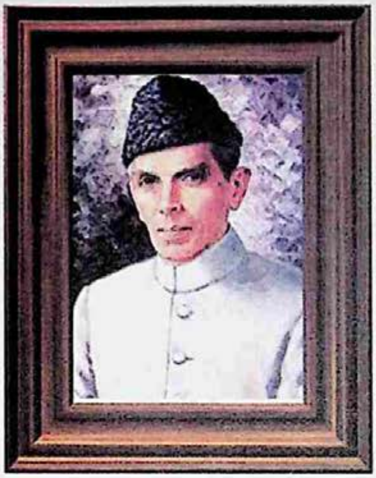

"تعلیم پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دُنیا اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ تعلیمی میدان میں مطلوبہ پیش رفت کے بغیر ہم نہ صرف اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ ہمارا نام و نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔"

قائداعظم محمد علی جناحؒ، بانیِ پاکستان
(26 ستمبر 1947ء۔ کراچی)

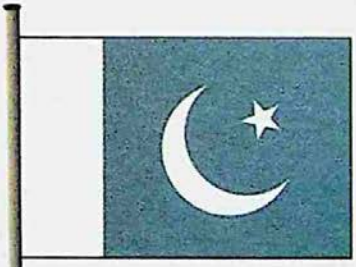

قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد باد　　کِشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان　　ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سَرزمین کا نِظام　　قُوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم ، مُلک ، سلطنت　　پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد
پرچمِ ستارہ و ہِلال　　رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال　　جانِ اِستِقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

4826

جعلی کُتب کی روک تھام کے لیے پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور کی درسی کُتب کے سرِوَرق پر مستطیل شکل میں ایک "حفاظتی نشان" چسپاں کیا گیا ہے۔ ترچھا کر کے دیکھنے پر اس نشان میں موجود مونو گرام کا نارنجی رنگ، سبز رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مونو گرام کے نیچے موجود سفید جگہ کو سِکّے سے کُھرچنے پر "PCTB" لکھا ظاہر ہوتا ہے۔ تصدیق کے لیے "حفاظتی نشان" پر دیے گئے کوڈ کو "8070" پر "PCTB(Space)Code No." لکھ کر SMS کریں اور انعامی سکیم میں شامل ہوں۔ اگر SMS کے جواب میں "حفاظتی نشان" پر درج سیریل نمبر موصول ہو تو کتاب اصلی ہے۔ درسی کُتب خریدتے وقت یہ "حفاظتی نشان" ضرور دیکھیں۔ اگر کسی کتاب پر یہ نشان موجود نہ ہو یا اس میں ردّ و بدل کیا گیا ہو تو ایسی کتاب ہرگز نہ خریدیں۔

مُرقّعِ ادَب

(اُردو اختیاری)

گیارھویں جماعت کے لیے

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں۔
منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب سازی) حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔
اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپرز، گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفین
☆ پروفیسر زرین حبیب مرزا
☆ مسز سعیدہ خالد
☆ پروفیسر فقیر احمد فیصل

مدیر
☆ پروفیسر حفیظ صدیقی

نگران
☆ ملک جمیل الرحمٰن (سینئر ماہرِ مضمون اُردو)

آرٹسٹ ☆ عائشہ وحید

ناشر: عطیہ پبلشنگ ہاؤس لاہور
مطبع: الرحیم آرٹ پریس، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2018ء	اول	نہم	6,000	61.00

فہرست

حصہ نثر

نمبر شمار	سبق	مصنف	صفحہ نمبر
1	اردو نثر پر ایک نظر	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (اخذ و اضافہ)	1
2	قصہ خواجہ سگ پرست کا	میرامن دہلوی	6
3	فسانہ سلطان یمن	رجب علی بیگ سرور	11
4	امراؤ جان ادا	مرزا ہادی رُسوا	16
5	خدا کی بستی	شوکت صدیقی	21
6	آنگن	خدیجہ مستور	26
7	زیور کا ڈبا	منشی پریم چند	31
8	کتبہ	غلام عباس	41
9	قلعہ لاہور کا ایک ایوان	سید امتیاز علی تاج	50
10	فاصلے	میرزا ادیبؔ	56
11	رسم و رواج	سر سید احمد خاں	66
12	شاعری کے لیے کیا شرطیں ضروری ہیں	مولانا الطاف حسین حالی	71
13	مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم	شبلی نعمانی	76
14	میبل اور میں	پطرس بخاری	82
15	منشیات کی لعنت	نصیر احمد بھٹی	87

حصہ شاعری

نمبر شمار	نظم	شاعر	صفحہ نمبر
1	اردو شاعری پر ایک نظر	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (اخذ و اضافہ)	92
2	حمد	مولانا ظفر علی خاں	97
3	نعت	امیر مینائی	101
4	شوقِ شہادت	میر انیس	105
5	برسات کی بہاریں	نظیر اکبر آبادی	109
6	عقل و دل	علامہ محمد اقبالؒ	113
7	جاوید کے نام	علامہ محمد اقبالؒ	113
8	شاہین	علامہ محمد اقبالؒ	114
9	پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ	علامہ محمد اقبالؒ	114
10	جوگی	خوشی محمد ناظر	116
11	مناظرِ سحر	جوش ملیح آبادی	120
12	درۂ خیبر	حفیظ جالندھری	123
13	زندگی سے ڈرتے ہو؟	ن۔م۔راشد	126
14	اقبالؒ	فیض احمد فیض	130
15	طلوعِ فرض	مجید امجد	133
16	قطعات	اکبر الہ آبادی، احسان دانش	137
17	رباعیات	مولانا الطاف حسین حالی	141

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو نثر پر ایک نظر

''اُردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''لشکر'' کے ہیں۔ مغلوں کے دور میں لشکر اور اس سے متعلقہ آبادی کو ''اُردو'' کہا جاتا تھا۔ اِس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ اردو ایک لشکری زبان ہے جو مسلمان بادشاہوں کے لشکروں یا لشکری بازار میں پیدا ہوئی۔ یہ درست نہیں۔ اِس سے پہلے اردو کو مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ برِ صغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے آنے کے بعد مسلمانوں اور یہاں کے باشندوں کی زبانوں کے میل جول سے جو نئی زبان آہستہ آہستہ پیدا ہوئی اسے ''ہندوی'' کے نام سے پکارا گیا۔ اِس کے بعد اسے ''ہندی'' کے نام سے پکارا گیا۔ اردو کا ایک قدیم نام ''ریختہ'' بھی ہے۔ میر تقی میر نے اِس زبان کو پہلی دفعہ'' اردوئے معلّٰی'' قرار دیا اور مصحفی نے اِسے ''اردو'' کہا۔ چناں چہ انیسویں صدی سے یہی نام رائج ہے۔

اردو زبان کے آغاز کے بارے میں کئی نظریے پیش کیے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان تمام نظریات میں ایک بات البتہ مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتدا کی بنیاد برِ صغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی ہے اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمان فاتحین کی ہندوستان میں آمد اور مقامی لوگوں سے میل جول اور مقامی زبانوں پر اثرات سے ہوا اور ایک نئی زبان وجود میں آئی جو بعد میں اردو کہلائی۔

اردو نثر کا پہلا باقاعدہ دور دکن کا ہے جہاں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین نے اسے عوام کی زبان کی حیثیت سے تبلیغ اور تعلیم دین کے لیے استعمال کیا۔ اس دور کے مشہور عالم خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات ۱۴۲۱ء) کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ادبی اعتبار سے دکنی دور کی سب سے مشہور تصنیف ملّا وجہی کی ''سب رس'' ہے جس کا سنِ تصنیف ۳۹-۱۶۳۸ء ہے۔ اردو کا یہ پہلا نثری قصہ ہے جس کا ایک منفرد اسلوب ہے۔

شمالی ہند میں اردو نثر نگاری کا آغاز نسبتاً بعد میں ہوا۔ دراصل یہاں پر مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ایک عرصے تک فارسی تہذیبی، سرکاری اور عدالتی زبان رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی تک شمالی ہندوستان میں اردو کی نثر نگاری کا جو اسلوب ملتا ہے، وہ انتہائی پر تکلف ہے اور اس میں فارسی تراکیب کی کثرت ہے۔ چنانچہ عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصّع'' (۱۷۹۸ء میں لکھی گئی) کی عبارت بھی فارسی آمیز ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر نگاری کا باقاعدہ آغاز کلکتہ ۱۸۰۰ء میں ''فورٹ ولیم کالج'' کے قیام سے ہوا۔ اس ادارے کا مقصد یہ تھا کہ جو انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر آئیں تو انھیں اِس ملک کی زبان، تاریخ، تہذیب، معاشرے اور رسم و رواج سے واقف کرانے کے لیے تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ اس مقصد کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے مصنفین جمع کیے گئے جن میں سب سے ممتاز میر امن دہلوی تھے۔ بعض ایسے انگریز بھی استاد مقرر ہوئے جو ہندوستانی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور نام جان گل کرسٹ کا ہے جو شعبۂ اردو کے سربراہ تھے۔

جان گل کرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے اردو میں مختلف کتابیں لکھیں جن میں سب سے ممتاز میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' ہے۔ اس کتاب کا سنِ تصنیف ۱۸۰۲ء ہے۔ میر امن نے اس قصّے میں دلی کی بامحاورہ اور روز مرّہ بول چال کی سادہ زبان میں اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے علاوہ حیدر بخش حیدری کی ''آرائشِ محفل'' نے بھی بہت مقبولیت حاصل کی۔ میر امن کے سادہ اسلوبِ نگارش کے مقابلے میں لکھنؤ کے مرزا رجب علی بیگ سرور نے ۲۵-۱۸۲۴ء میں فارسی آمیز پر تکلف عبارت میں ''فسانۂ عجائب'' لکھا، جو اپنے مخصوص اسلوبِ بیان کے باعث اہم ہے۔

۱۸۴۰ء کے آس پاس مرزا غالب جو اپنے عہد کے فارسی اور اردو کے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں میں شمار ہوتے تھے، اردو خطوط نویسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اردو میں خط لکھنے کا ایک بے تکلف انداز اختیار کیا اور بقول خود مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ''عودِ ہندی''، ''اردوئے معلّی'' اور ''مکاتیبِ غالب'' کے نام سے ان کے خطوط کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں جو اپنی سادہ اور رواں زبان، انوکھے اور دلچسپ انداز کے باعث آج بھی دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں غالب کی زندگی اور اس زمانے کے بہت سے حالات و واقعات کو جاننے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ غالب کے ان خطوط سے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ ہوا۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں صرف ایک سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ ایک تہذیبی انقلاب تھا۔ اس سے برِصغیر میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور اقتدار کے ساتھ اس تہذیب و تمدن کی برتری بھی ختم ہو گئی جسے مسلمانوں نے صدیوں کی کوششوں سے پروان چڑھایا تھا۔ اِس انقلاب کے نتیجے میں مسلمان دوہرے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف وہ انگریز حکمرانوں کے غیظ و غضب کا شکار تھے اور دوسری طرف ہندوؤں کے، جنھوں نے انگریزوں کی سرپرستی میں مسلمانوں کا معاشی استحصال شروع کر دیا۔ ان حالات میں برِصغیر پاک و ہند میں وہ تحریک شروع ہوئی جسے تحریکِ سرسید یا علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک بنیادی طور پر تعلیمی و اصلاحی تحریک تھی۔ سرسید نے اپنے خیالات کے فروغ اور ابلاغ کے لیے سلیس اور سادہ اردو نثر کا استعمال کیا۔ انھوں نے ایک ادبی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے جاری کیا جس میں سرسید نے سب سے پہلے انشائیے اور مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ سرسید کے دوسرے رفقا نے اس عمل میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ سرسید احمد خان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسے مخلص رفقائے کار ملے جنھوں نے ان کی ادبی تحریک کے استحکام اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا نذیر احمد اس حلقے کے ممتاز اراکین ہیں۔

سرسید کے رفقائے کار میں سے مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ کو ایک نئے رنگ سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی کتابوں میں ''الفاروق''، ''المامون'' اور ''سیرت النبیؐ'' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نذیر احمد نے اردو ناول نگاری کا آغاز کر کے اردو ادب میں ناول کی صنف کو متعارف کرایا۔ ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' ان کے مشہور ناول ہیں۔ ان کے ناول مقصدی ہیں اور ان کے پیش نظر اس عہد کا مسلم معاشرہ اور اس کی اصلاح ہے۔ مولانا حالی نے اپنے شعری نظریات اور خیالات کو ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے نام سے قلم بند کیا جسے اردو میں تنقید کی اوّلین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے ''حیاتِ جاوید''، ''حیاتِ سعدی'' اور ''یادگارِ غالب'' لکھ کر اردو میں سوانح عمریاں لکھنے کا آغاز بھی کیا۔ اِسی طرح مولانا محمد حسین آزاد نے جو بیک وقت انشا پرداز، مورخ، نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات تھے ''آبِ حیات''، ''سخن دانِ فارس'' اور ''نیرنگِ خیال'' وغیرہ لکھیں جو اردو نثر میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

اردو ناول نگاری میں نذیر احمد کے ہم عصر ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں جن کا سب سے مشہور ناول ''فسانۂ آزاد'' ہے۔ اگرچہ اس ناول میں کوئی منظم پلاٹ نہیں لیکن اس میں اس عہد کی لکھنوی تہذیب اور معاشرے کی پوری تصویر موجود ہے۔ سرشار کے ہم عصر عبدالحلیم شرر کو اردو میں تاریخی ناول کا پہلا علم بردار کہا جاتا ہے۔ ''منصور موہنا''، ''ملک العزیز ورجینا'' اور ''فردوس بریں'' ان کے مشہور تاریخی ناول ہیں۔ اس کے بعد اردو ناول نگاری میں مرزا رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' بڑی اہمیت اور شہرت کا حامل ہے جو اپنی بہت سی فنی خوبیوں کے باعث اردو کے عظیم ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں اس عہد کی لکھنوی سوسائٹی کی زندگی کی بھرپور مصوری کی گئی ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں علامہ راشد الخیری نے جنھیں ''مصورِ غم'' کہا جاتا ہے اپنے ناولوں میں اس روایت کو آگے بڑھایا جس کا آغاز مولوی نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' لکھ کر کیا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی مظلومیت کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

اردو ناول کا دورِ جدید بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ''میدانِ عمل''، ''گئودان'' اور ''بازارِ حسن'' وغیرہ مشہور ہیں۔ انھوں نے برصغیر کے دیہات اور متوسط و محنت کش طبقوں کی زندگی کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔

پریم چند کے زیرِ اثر اور ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز پر بہت سے اچھے ناول لکھے گئے جن میں سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' کرشن چندر کی ''شکست'' اور عصمت چغتائی کی ''ٹیڑھی لکیر'' قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے عہد کا دور ناول کی مقبولیت کا دور ہے۔ رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، ایم اسلم، نسیم حجازی اور قیسی رام پوری کے ناول بہت مشہور ہوئے۔ قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، عزیز احمد کا ''ایسی بلندی ایسی پستی''، شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' اور ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی'' فنی لحاظ سے اہم ناول ہیں۔ ان کے علاوہ عبداللہ حسین کا ''اُداس نسلیں''، جمیلہ ہاشمی کا ''تلاشِ بہاراں''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، فضل احمد کریم فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک''، انتظار حسین کا ''بستی'' اور بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' اہم ناول ہیں۔

افسانے کی صنف بھی ناول کی طرح اردو نثر میں انگریزی ادب سے آئی۔ اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی میں پریم چند کے افسانوں سے ہوا۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہات میں رہنے والے لوگوں کے مسائل پر قلم اٹھایا اور اردو افسانے کو حقیقت نگاری کے فن سے آشنا کرایا۔ اسی دور میں سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں کے ذریعے رومانوی افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ سجاد حیدر یلدرم کی پیروی کرنے والوں میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری اور حجاب امتیاز علی اہم ہیں جنھیں رومانوی افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔

راشد الخیری اور علی عباس حسینی اہم ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو بھی متاثر کیا۔ پریم چند کے افسانے ''کفن'' میں اس تحریک کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اردو افسانے میں ترقی پسند رجحانات کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں ''انگارے'' کے نام سے چھپنے والے افسانوں کے مجموعے سے ہوئی جس میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، رشید جہاں اور احمد علی وغیرہ کے افسانے تھے۔ اِس تحریک کے زیرِ اثر افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ نظر آتی ہے جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور سعادت حسن منٹو کے نام اہم ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک افسانے کے فن کو فروغ دینے والوں میں علی عباس حسینی، کوثر چاند پوری، اعظم کریوی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، غلام عباس، انتظار حسین، شوکت صدیقی، محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی اور خواجہ احمد عباس کے نام اہم ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد افسانوی ادب میں اہم اضافے کرنے والوں میں غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، اے حمید، الطاف فاطمہ، غلام الثقلین نقوی، انتظار حسین اور انور سجاد کے نام اہم ہیں۔ خالدہ اصغر، محمد منشا یاد، یونس جاوید، مسعود اشعر اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں بدلتی ہوئی زندگی کے مسائل کی کامیاب ترجمانی کر رہے ہیں۔

اردو زبان و ادب میں ڈرامے کی صنف بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اردو میں ڈرامے کی ابتدا واجد علی شاہ اختر کے عہد (۱۸۵۶ء۔۱۸۴۷ء) میں لکھنؤ میں ہوئی اور امانت لکھنوی نے سب سے پہلا ڈراما ''اندر سبھا'' لکھا۔ اس ڈرامے میں راجہ اندر کے دربار اور عیش و عشرت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو ڈراما تھیٹر سے وابستہ رہا لیکن بیسویں صدی میں آغا حشر اردو ڈراما میں ایک نامور شخصیت کے طور پر ابھرے۔ انھوں نے نہ صرف شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا بلکہ بہت سے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ حشر نے اپنے ان ہر دو قسم کے ڈراموں میں عوام کی پسند کو پیشِ نظر رکھا۔ وہ ڈرامے میں کوئی ایسی کشمکش یا پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ہر قسم کے مزاج کے لوگ ان کے ڈراموں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آغا حشر کے بعد احمد شجاع پاشا کا ڈراما ''باپ کا گناہ'' ادبی لحاظ سے اہم ہے لیکن جو شہرت امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کو ملی وہ کسی اور ڈرامے کو نصیب نہ ہوئی۔ اس دوران میں سینما کی آمد سے سٹیج ڈرامے کے زوال کا آغاز ہوا لیکن ریڈیو کے قیام سے ریڈیائی ڈرامے لکھنے کا رواج ہوا تو عشرت رحمانی، حجاب امتیاز علی، عابد علی عابد، انور جلال، باقی صدیقی، میرزا ادیب، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈرامے بہت مشہور ہوئے۔ ٹیلی ویژن کے متعارف ہونے پر ڈراما نگاروں کی ایک بہت بڑی اور ذہین کھیپ سامنے آئی جن میں سلیم چشتی، اطہر شاہ خاں، یونس جاوید، امجد اسلام امجد، منو بھائی، جمیل ملک اور ریاض بٹالوی کے نام اہم ہیں۔ خواتین ڈراما نگاروں میں حسینہ معین اور فاطمہ ثریا بجیا کے نام سرِ فہرست ہیں۔

اردو نثر میں علمی و ادبی موضوعات پر لکھنے والوں میں مولانا حالی کے جانشین مولوی عبدالحق ہیں جنھیں ''بابائے اردو'' کے لقب سے یاد کیا

جاتا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھ کر اردو کے نثری سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ شبلی نعمانی سے فیض پانے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام قابلِ ذکر ہے جو اردو نثر میں ایک منفرد اسلوب نگارش کے موجد ہیں۔

ایک اور جدید صنف جسے اردو نثر میں بڑا فروغ نصیب ہوا طنز و مزاح ہے۔ یوں تو طنز و مزاح کی مثالیں ''اودھ پنچ'' کے دور میں بھی ملتی ہیں جو ایک انگریزی اخبار کے نمونے پر جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے مذاق اور طنز کی سطح زیادہ بلند نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں سب سے زبردست ادبی شخصیت غالب کی ہے جو بہت بڑے ظریف بھی تھے اور اسی بنا پر حالی نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ غالب کے خطوط میں ظرافت کی صاف ستھری اور بہت اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ غالب کے بعد مزاح نگاری میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، شوکت تھانوی، ابن انشا اور موجودہ دور کے مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمان اور عطاء الحق قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' اور ''شعر العجم'' لکھ کر اردو نثر میں تنقیدی ادب کا باقاعدہ آغاز کیا تھا اس روایت کو آگے بڑھانے میں امداد امام اثر، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، حافظ محمود شیرانی، نور الحسن ہاشمی، حامد حسن قادری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں اور یوں اردو نثر ہر صنفِ ادب میں ترقی کی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔

داستان

کہانی سننا اور کہنا انسان کو ہمیشہ سے مرغوب رہا ہے۔ جب انسان روزمرہ زندگی کے معمولات اور تھکا دینے والی مصروفیات کی یکسانیت سے اُکتا جاتا تو وہ تفریح کی تمنا کرنے لگتا۔ اِس ضرورت نے داستان گوئی کو جنم دیا۔ داستان گو طویل کہانیوں کو رات کے وقت محفل میں قسط وار سناتے، کہانی میں سے کہانی جنم لیتی اور ہر کہانی دوسری کہانی سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح پیوست بھی ہوتی اور اپنا علیحدہ مکمل وجود بھی رکھتی تھی۔ داستان گو اپنی قوتِ تخیل سے واقعات کو ترتیب دے کر داستانوں کی تخلیق کرتے، ان کو دلکش، دلچسپ اور زندگی سے برتر کرداروں اور طلسماتی اور پراسرار ماحول سے سجاتے اور اپنی چرب زبانی اور زبان دانی کی مہارت سے لوگوں کو سنا کر اپنا گرویدہ بناتے۔ چنانچہ عرب کے ساحر، ایران کے قصہ گو اور برِ صغیر کے داستان گو بہت مشہور اور مقبول تھے۔ بلکہ قصہ گوئی ایک الگ فن کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ بعد میں آنے والی تمام افسانوی اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ کی بنیاد داستان پر ہی ہے۔

''داستان'' قدیم صنفِ ادب ہے جس کے لغوی معنی قصہ، حکایت یا کہانی کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں داستان کسی خیالی اور مثالی دنیا کی وہ کہانی ہے جو محبت، مہم جوئی اور سحر و طلسم جیسے غیر معمولی عناصر پر مشتمل اور مصنف کے آزاد اور زرخیز تخیل کی تخلیق ہو۔ داستانوں میں مافوق الفطرت اشیا، واقعات اور مقامات کی کثرت ہوتی ہے۔ جادو کی چیزوں، جن، بھوت اور پری جیسی مخلوق کا ذکر عام ہوتا ہے۔ داستانوں کا دور چونکہ بادشاہوں اور شہزادے شہزادیوں کا دور تھا اِس لیے ان میں مرکزی اہمیت انھی کی ہے۔ بیشتر کردار اور واقعات مثالی ہوتے ہیں جو بالآخر کسی مثالی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ گویا مافوق الفطرت عناصر، طلسماتی فضا، تخیل کی رنگ آمیزی، عشق و محبت کے واقعات، حق و باطل کا تصادم، اسرار و تحیّر، طوالت اور دلچسپ زبان و بیان ایک اچھی داستان کی اہم خوبیاں ہیں۔

اردو میں میر امن کی ''باغ و بہار''، حیدر بخش حیدری کی ''آرائشِ محفل''، رجب علی بیگ سُرور کی ''فسانۂ عجائب'' اور ان شاء اللہ خان انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' معروف داستانیں ہیں۔

میر امن دہلوی

سال ولادت: ۱۷۳۳ء　　　　سال وفات: ۱۸۱۲ء

میر امن دہلوی دِلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام میر امان اور تخلص لطف تھا مگر ان کی شہرت میر امن دہلوی کے نام سے زیادہ ہوئی۔ میر امن کے آباو اجداد مغل بادشاہ ہمایوں کے زمانے میں سلطنت مغلیہ سے منسلک رہے۔ چنانچہ مغل بادشاہوں کی خدمت کے صلے میں انھیں کافی جاگیریں، وظائف اور انعام واکرام بھی حاصل ہوئے۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے نتیجے میں جب دہلی کے حالات ناگفتہ بہ ہوگئے تو میر امن کو بھی بادلِ ناخواستہ دہلی چھوڑ کر عظیم آباد (پٹنہ) میں پناہ لینی پڑی۔ میر امن کچھ عرصہ یہاں قیام پذیر ہونے کے بعد کلکتہ چلے گئے جہاں وہ دو سال تک نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی کے اتالیق رہے۔ انھی دنوں فورٹ ولیم کالج کو ماہر ادیبوں اور تجربہ کار منشیوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے میر امن کے ایک دوست میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے میر منشی تھے، انھی کی وساطت سے میر امن کی ملاقات فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گل کرسٹ سے ہوئی۔ گل کرسٹ نے میر امن کو فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں بطور منشی ملازم رکھ لیا۔

فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی ملازمت کے دوران میں میر امن نے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' کا ''باغ وبہار'' کے نام سے اردو ترجمے کا کام شروع کیا جو ۱۸۰۲ء میں اختتام کو پہنچا۔ میر امن کے منفرد اسلوب بیان نے ''باغ وبہار'' کو محض ایک دلکش اور پُرکشش قصہ ہی نہیں رہنے دیا بلکہ اردو ادب کی اوّلین اور زندۂ جاوید داستان بنا دیا۔ ''باغ وبہار'' کو دبستان دہلی کی نمائندہ داستان بھی کہا جاتا ہے۔ ''باغ وبہار'' دہلوی معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔

میر امن کا طرزِ تحریر نہایت سہل، سادہ، عام فہم اور بامحاورہ ہے۔ میر امن نے مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہوئے جو سلیس ورواں اندازِ بیان اپنایا اس کی حیثیت مثالی ہے۔

میر امن کی دوسری تصنیف ''گنجِ خوبی'' ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ''اخلاقِ محسنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔ تاہم جو مقبولیت ''باغ وبہار'' کے حصے میں آئی وہ کسی اور داستان کو حاصل نہ ہوسکی۔ ''باغ وبہار'' ایک طویل داستان ہے جو چار درویشوں کے قصوں کے علاوہ خواجہ سگ پرست کے قصے پر مشتمل ہے۔

قصہ خواجہ سگ پرست کا

خواجہ نے کہا: اے بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے، غُلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے، منجھلا برادر ہے؛ مَیں اِن دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ مُلک فارس میں سوداگر تھا۔ جب میں چودہ برس کا ہوا، قبلہ گاہ نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اُٹھ چکے؛ ایک روز اِن دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ اَب باپ کا مال جو کچھ ہے، تقسیم کر لیں۔ جس کا دل جو چاہے، سو کام کرے۔ میں نے سُن کر کہا: اَے بھائیو! یہ کیا بات ہے! میں تمھارا غُلام ہوں، بھائی چارے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مرگیا، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نانِ خشک چاہتا ہوں جس میں زندگی بَسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں۔ مجھے حصّے بخرے سے کیا کام ہے! تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھرلوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا۔ میں لڑکا ہوں، کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں؛ مجھ سے کیا ہو سکے گا! ابھی تم مجھے تربیت کرو۔

یہ سُن کر جواب دیا کہ تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور مُحتاج کرے۔ میں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں، میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔ اِسی فکر میں سو گیا۔ صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔ قاضی نے کہا: کیوں اپنے باپ کا وَرثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا؟ میں نے گھر میں جو کہا تھا وہاں بھی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا: اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے، تو ہمیں لادعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال واَسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔ تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرف نہ کرے۔ بہ موجب ان کی مرضی کے فارغ خطی بہ مہر قاضی میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے، میں گھر میں آیا۔

دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے: اَے بھائی! یہ مکان جس میں تو رہتا ہے، ہمیں دَرکار ہے؛ تو اپنی بود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر جا رہ۔ تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں۔ لاچار ارادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا؛ تو جس وقت سفر سے آتا، ہر ایک مُلک کا تحفہ بہ طریق سَوغات کے لاتا اور مجھے دیتا؛ اِس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے میں نے اُن کو بیچ بیچ[1] کر تھوڑی سی اپنی نج کی پونجی بہم پہنچائی تھی، اُسی سے کچھ خرید فروخت کرتا۔ ایک بار لونڈی میری خاطر تُرکستان سے میرا باپ لایا اور ایک دَفعہ گھوڑے لے کر آیا، اُن میں سے ایک بچھیڑا ناگند، کہ ہونہار تھا، وُہ بھی مجھے دیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اُس کا کرتا تھا۔

آخر اِن کی بے مُروّتی دیکھ کر ایک حویلی خرید کی، وہاں جارہا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے اَسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لیے اور باقی پونجی سے ایک دُکان بزازی کی کر کے، خدا کے توکل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی پر خدا جو مہربان ہوا، تین برس کے عرصے میں ایسی دُکان جمی کہ میں صاحبِ اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ جاتا، میری ہی دُکان سے جاتا۔ اُس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گزرنے لگی۔ ہر دم جناب باری میں شکرانہ کرتا اور آرام سے رہتا۔ اتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا سودے سُلف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے، تم خوشی مناؤ، لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے؟ میں نے کہا: اَے حبشی!

---

[1] بیچ بیچ

ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟ اُس نے کہا: یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چورا ہے میں، ایک یہودی نے مشکیں باندھیں[1] ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے، تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔ بھلا مجھے ثواب تو ہوگا۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو، یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ بات غلام سے سنتے ہی لہو نے جوش کیا، ننگے پانو[2] بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا: جلد روپے لے کر آؤ۔ جونہیں[3] وہاں گیا، دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا، سچ ہے، اِن پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا: واسطے خُدا کے! ذرا رہ جاؤ، میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے، جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے۔

یہ کہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا: آج روزِ آدینہ[4] ہے ان کو کیوں ضربِ شلاق کر رہا ہے؟ اُس نے جواب دیا: اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو، اِن کے عوض روپے حوالے کرو، نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔ میں نے کہا: کیسے روپے! دست آویز نکال، میں روپے گن دیتا ہوں۔ اُن نے کہا: تمسک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔ اِس میں میرے دونوں غلام دو بدرہ روپے لے کر آئے۔ ہزار روپے میں نے یہودی کو دیے اور بھائیوں کو چھڑایا۔ اِن کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکھے[5] پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا، وونہیں[6] حمام میں نہلوایا، نئی پوشاک پہنائی، کھانا کھلایا۔ ہرگز اِن سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا، شاید شرمندہ ہوں۔

اَے بادشاہ! یے[7] دونوں موجود ہیں، پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹھ[8] بھی ہے۔ خیر جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے، ایک روز میں نے کہا کہ اَے بھائیو! اب اِس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو، بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔ یہ سن کر چپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں، سفر کی تیاری کرنے لگا۔ پال پرتل، بار برداری اور سواری کی فکر کر کے، بیس ہزار روپے کی جنس تجارت کی خرید کی۔ ایک قافلہ سوداگروں کا بُخارے کو جاتا تھا، اُن کے ساتھ کر دیا۔

بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا، ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا۔ اُس نے کہا: جب بخارے میں گئے، ایک نے جوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دیا، اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ[9] کو لیپتا پوتا ہے۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں، اُن کی خدمت کرتا ہے، وہ بہ طریق خیرات کے کچھ دیتے ہیں، وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے۔ اور دوسرا بوزہ فروش[10] کے لڑکے پر عاشق ہوا۔ اپنا مال سارا صرف کیا، اب وہ بوزے خانے کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قافلے کے آدمی اس لیے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا۔

یہ اَحوال اُس شخص سے سن کر میری عجب حالت ہوئی۔ مارے فکر کے نیند، بھوکھ[11] جاتی رہی۔ زادِ راہ لے کر قصد بُخارے کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈھونڈھ ڈھانڈھ[12] کر اپنے مکان میں لایا۔ غُسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی اور اِن کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشا پور کے آیا، ایک گانو[13] میں بہ مع[14] مال اَسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا۔ اِس لیے کہ میرے آنے کی کسو[15] کو خبر نہ ہو۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں۔ کل اُن کے اِستقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صُبح کو چاہا کہ چلوں ایک گرہست[16] اُسی مَوضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ میں اس کی آواز سُن کر باہر نکلا۔ اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وُہ بولا: تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے۔ کاشکے[17] اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے!

---

1 باندھی ہیں 2 پاؤں 3 جونہی 4 آدینہ (جمعہ) 5 بھوکے 6 وہیں 7 یہ 8 جھوٹ
9 جوا کھیلنے کا اڈا 10 شراب بیچنے والا 11 بھوک 12 ڈھونڈ ڈھانڈ 13 گاؤں 14 مع
15 کسی 16 خانہ دار۔ رہنے والا 17 کاش

میں نے پوچھا: کیا مُصیبت گزری؟ بولا کہ رات کو ڈاکا[1] آیا' اُن کا مال وأسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے[2] دونوں کہاں ہیں؟ کہا: شہر کے باہر ننگے منگے' خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ ڈونہیں[3] دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا' پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر ان کے دیکھنے کو آتے تھے اور یے مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اِسی طرح گزرے۔ تب میں نے اپنے دل میں غور کی[4] کہ کب تلک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے۔ بنے تو اِن کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔ بھائیوں سے کہا: اگر فرمایئے تو یہ فِدوی آپ کے ساتھ چلے۔ یے خاموش رہے۔ پھر لوازِمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور ان کو ساتھ لیا۔

جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اَسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اُٹھایا' ناؤ چلی یہ کتا کنارے پر سو رہا تھا: جب چونکا اور جہاز کو منجھدھار[5] میں دیکھا حیران ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک پن سُوئی[6] دَوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینا خیر و عافیت سے دریا میں گزرا۔ کہیں منجھلا بھائی میری لونڈی پر عاشق ہوا' ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی مِنّت اُٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی، اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے' اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال اَسباب کے قابض' متصرف ہوں۔

ایک دن میں جہاز کی کوٹھری میں سوتا تھا اور لونڈی پانو[7] داب رہی تھی' منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کُتا بھی میرے ساتھ ہولیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے نہڑا[8] ہوا' تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔ میں نے پاس جا کر کہا: خیر تو ہے؟ بولا: عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ناچتے ہیں۔ اگر اور کوئی ایسی بات خلافِ قیاس کہتا تو میں نہ مانتا' بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا' دیکھنے کو سر جھکایا۔ ہر چند نگاہ کی' کچھ نظر نہ آیا اور وہ یہی کہتا رہا: اب دیکھا؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اس میں مجھے غافل پا کر' منجھلے نے اُچانک پیچھے آ کر ایسا دھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا' اور وُہ رونے دھونے لگے کہ دَوڑیو! ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا۔

اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا' آخر تھک گیا۔ خُدا کو یاد کرتا تھا' کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا' آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا' میرے ساتھ یہ بھی کودا اور تیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا۔ میں نے اس کی دُم پکڑ لی۔ اللہ نے اِس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات یہی صورت گزری۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مطلق نہ تھی۔ لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا رہا۔ دوسرے دن کُتے کی آواز کان میں گئی' ہوش میں آیا' خدا کا شکر بجالایا۔

(باغ و بہار)

۱۔ڈاکا پڑا ۲۔وہ ۳۔وہیں ۴۔غور کیا ۵۔منجدھار ۶۔چھوٹی کشتی ۷۔پاؤں ۸۔جھکا ہوا

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں؟

i- زیرِ نظر اقتباس میں قصہ بیان کرنے والے کو "خواجہ سگ پرست" کہنے کا کیا جواز سامنے آتا ہے؟

ii- خواجہ سگ پرست نے اپنے بھائیوں کے ناروا سلوک کے باوجود کن کن مواقع پر ان کی مدد کی؟

iii- کتے نے کن کن مواقع پر اپنے آقا کی مدد کی؟

iv- بڑے بھائی نے خواجہ سگ پرست کو دریا کا نظارہ دکھانے کے لیے کیا بہانہ بنایا؟

2- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب سے پہلے (✓) کا نشان لگائیں:

i- "قصہ خواجہ سگ پرست کا" کس داستان سے لیا ہوا اقتباس ہے؟

(ا۔ باغ و بہار سے　　ب۔ فسانۂ عجائب سے　　ج۔ آرائشِ محفل سے　　د۔ رانی کیتکی کی کہانی سے

ii- اس داستان کا مصنف کون ہے؟

(ا۔ رجب علی سرور　　ب۔ میر امن　　ج۔ حیدر بخش حیدری　　د۔ ان شاء اللہ خاں انشا

iii- میر امن کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

(ا۔ شاعری　　ب۔ مضمون نگاری　　ج۔ داستان گوئی　　د۔ ڈراما نگاری

iv- میر امن کے اندازِ تحریر کی خاص خوبی کیا ہے؟

(ا۔ پر تکلف تحریر　　ب۔ شاعرانہ نثر نگاری　　ج۔ سادگی　　د۔ مشکل تراکیب کا کثرت سے استعمال

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے۔

ii- ایسی دکان جمی کہ میں صاحبِ اعتبار ہوا۔

iii- اللہ نے اس کو میری زندگی کا سبب کیا۔

4- "خواجہ سگ پرست اور اس کے بھائیوں کے کرداروں میں نیکی اور بدی کا امتیاز موجود ہے" داستان کے پڑھے ہوئے حصے میں سے مثالیں دے کر اس کی وضاحت کریں۔

5- کردار نگاری سے مراد سیرت نگاری یا کسی داستان یا قصے کے افراد کے احوال و اطوار کا بیان ہے۔
خواجہ سگ پرست کے کردار پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔

6- کتاب میں شامل "باغ و بہار" کے اقتباس سے جو اخلاقی سبق ملتا ہے، مختصراً بیان کریں۔

7- اُسلوب کا مطلب ہے "طور، طریقہ، انداز، وضع"۔ اُسلوبِ تحریر سے مراد ہے کسی مصنف کا لکھنے کا انداز یعنی اس کے لکھنے کا خاص انداز کیا ہے، اس میں کیا خوبیاں ہیں، کیا خامیاں ہیں وغیرہ۔
"باغ و بہار" کے حوالے سے میر امن کے اسلوب اور فن پر بحث کریں۔

رجب علی بیگ سرور

سالِ ولادت: ۱۷۸۷ء | **سالِ وفات: ۱۸۶۷ء**

رجب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سرور کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ سرور نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں پائی۔ عربی اور فارسی میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے موسیقی اور خوش نویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ علاوہ ازیں خطاطی، تیراندازی، شہ سواری اور شاعری سے بھی خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ شاعری میں سرور نے میر سوز کی شاگردی اختیار کی اور شعر کہنے لگے۔ تاہم سرور کی شہرت کا انحصار ان کی شاعری پر نہیں بلکہ نثر پر ہے۔

۱۸۱۹ء میں اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر برہم ہو کر سرور کو لکھنؤ سے جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ سرور لکھنؤ سے کان پور پہنچے اور وہاں اُنھوں نے اپنے دوست حکیم اسد علی کے کہنے پر ''فسانۂ عجائب'' لکھی۔ ۱۸۴۶ء میں سرور، واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تو واجد علی شاہ نے نہ صرف انھیں معاف کر کے لکھنؤ واپس بلا لیا بلکہ خوب عزت افزائی کی اور درباری شاعروں میں شامل کر لیا۔ ۱۸۵۶ء میں جب سلطنت اودھ پر زوال آیا اور واجد علی شاہ کو بھی اقتدار سے محروم ہونا پڑا تو سرور کو دوسری بار لکھنؤ ترک کرنا پڑا جس کی بنا پر انھیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انھی دنوں مہاراجا بنارس ایشری پرشاد نارائن سنگھ نے سرور کو اپنے پاس بلا لیا۔ مہاراجا علم و فن کا بڑا قدر دان تھا۔ اس نے سرور کو بہت عزت بخشی اور اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔ ۱۸۶۷ء میں سرور نے بنارس ہی میں وفات پائی۔

سرور نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔ ''فسانۂ عجائب'' ان کی زندہ و جاوید تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ''سرور سلطانی''، ''شررِ عشق''، ''شگوفۂ محبت''، ''گلزارِ سرور''، ''شبستانِ سرور'' اور ''انشائے سرور'' نے بھی خاصی شہرت حاصل کی مگر جو مقبولیت و شہرت ''فسانۂ عجائب'' کو حاصل ہوئی وہ ان کی دیگر تصانیف کو نہ مل سکی اور اسی کی بنا پر سرور کا نام آج تک زندہ ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' دبستانِ لکھنؤ کی نمائندہ تصنیف ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ حسن و عشق کی داستان ہے۔ اس کا طرزِ تحریر مقفّٰی، مسجع اور پُرتکلف ہے۔

سرور نے ''فسانۂ عجائب'' کی تحریر میں دلکشی و رنگینی پیدا کرنے کے لیے جابجا فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ و محاورات، نادر تشبیہات، استعارات اور انوکھی تراکیب کا بکثرت استعمال کیا ہے جس کی بنا پر ان کی تحریر بہت بوجھل، پیچیدہ اور دقیق ہو گئی ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' لکھنوی معاشرت اور رسوم و رواج کی آئینہ دار ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''فسانۂ عجائب'' سرور کی انشا پردازی کا نادر نمونہ اور اہم اردو داستان ہے۔

رجب علی بیگ سرور

فسانۂ سلطانِ یمن

سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اُس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج وتخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اُس کا نزدیک و دور ''خدادوست'' مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خدادوست ہے، تو لِلّٰہ تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بِسْمِ اللّٰہ۔ جو اَراکینِ سلطنت، مسند نشینِ حکومت حاضر تھے؛ بہ تاکید اُنھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتابِ سلطانی ہوگا۔ یہ فرما، وہ فرماں روا تخت سے اُٹھا، سائل جا بیٹھا، حکم رانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا: اب قصد کیا ہے؟ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ سائل بولا: پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا، برائے خدا یہ تاج وتخت یک لخت مجھے بخش دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بہ رضائے خدا یہ حکومت آپ کو مبارک ہو، میں بہ خوشی دے چکا۔ بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیہات لیا، فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا: اتنے دنوں سلطنت، حکومت کی، چندے فقیری کی کیفیت، فاقے کی لذّت دیکھیے۔ گو جاہ و حشم مفقود ہے، مگر شاہی بہ ہر کیف موجود ہے، اِلّا اس شہر میں سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکم خدا قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایتِ خالق سے کیا بعید ہے جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا، بلکہ تکلف کا لباس بھی وہ خدا شناس بار سمجھا، نہ لیا، اور چل نکلا۔ نیرنگی سپہرِ بوقلموں، دنیائے دوں کا یہ نقشہ ہے مصرع:

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است [1]

کل وہ سلطنت، ثروت، کروفر، افسر و تاج، آج یہ مصیبت، اذیّت، در بہ در، پیادہ پا سفر محتاج۔ کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقارہ و کُوس، بہ ہزار رنج و تعب چلتا۔ جو کچھ میسر آیا تو روزی ہوئی، نہیں تو روزہ۔ یوں ہی ہر روز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی، چند روز میں ایک شہر ملا، مسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا۔ قافلہ باہر اُتار، تنہا گھوڑے پر سوار، سیر کرتا مہمان سرا میں وارد ہوا۔ شہ زادی گو کہ گردِ راہ صعوبتِ سفر کی مبتلا تھی، لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدیؔ:

حاجتِ مشاطہ نیست روئ دلآرام را [2]

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بہ یک نگاہ از خود رفتہ ہوا، سانس سینے میں اڑی۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ یہ بے چارے اللّٰہ کے ولی، وہ شقی۔ بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اس عرصے میں وہ غدار حیلہ سوچا۔ بہت فسردہ خاطر ہو کر کہا: اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اُترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زہ ہو رہا ہے۔ دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں۔ تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو للّٰہ میرے ساتھ کر دے، تا کہ اس کی شراکت سے اُس کو رنج سے نجات ملے، وگرنہ بندۂ خدا کا مفت خون ہوتا ہے، آدمی کا مر جانا زبوں ہوتا ہے۔ یہ اللّٰہ کا نام سن کر گھبرائے، بی بی سے کہا: زہے نصیب! جو محتاجی میں کسی کی حاجت بر آئے، کام نکلے۔ بسم اللّٰہ، دیر نہ کرو۔ اُس نے دم نہ مارا، کھڑی ہو گئی، سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل اُس غریب سے کہا: قافلہ دور ہے، مجھے

---

[1] یہ مصرع حافظؔ کا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا کسی سے وفا نہیں کرتی۔ [2] یہ مصرع شیخ سعدی کا ہے جس کا مطلب ہے ''محبوب کے چہرے یعنی خوب صورت چہرے کو کسی سجانے بنانے والی کی حاجت نہیں ہوتی یعنی خوب صورت چہرہ آرائش کا محتاج نہیں ہوتا''۔

آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے، آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں۔ وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پر بٹھا، باگ اُٹھائی۔ قافلے کے پاس پہنچ کے کوچ کا حکم دیا، آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا۔ اُس وقت اُس نیک بخت نے داد بیداد، فریاد مچائی۔ تڑپی، روئی پیٹی، چلائی۔ آہ وزاری اس کی، اُس بے رحم، سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی۔

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا: خود چلیے، دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا۔ ہر چند ڈھونڈھا، نشان کے سوا قافلے کا سراغ نہ ملا۔ دور گرد سیاہ اُڑتی دیکھی، جرس اور زنگ کی صدا سنی۔ نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب، سب طرح کا عذاب۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار۔ نہ خدا ترس، نہ فریاد رس۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ یہ کہا، مصحفیؔ:

تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے، تو ہم رہے [1]

لاچار، لڑکوں کو لے کر اُسی طرف چلا۔ چند گام چل کر اضطراب میں راہ بھول گیا۔ ایک ندی حائل پائی، مگر کشتی نہ ڈونگی نہ ملاح۔ نہ راہ سے یہ آشنا، نہ وہاں سیاح کا گزارا۔ کنارے پر دریا کے خاک اُڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا، رہ بر کامل کو پکارا، ساحل مطلب سے ہم کنار نہ ہوا، بیڑا پار نہ ہوا۔ مگر کچھ ڈھبڑ ھبانے کا ڈھب تھا، گو گھاٹ کڈھب تھا: ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا، دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا، کنارے کا لڑکا بھیڑیا اُٹھا لے چلا۔ وہ چلایا، بادشاہ آواز سن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مضطرب جو ہوا، خود غوطے کھانے لگا، لیکن زندگی باقی تھی، بہ ہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا: بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب کے مُوا۔ نیرنگیِ فلک سے عالمِ حیرت، بی بی کے چھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے الم سے دل کباب، سلطنت دینے سے خستہ و خراب۔

اسی پریشانی میں شکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ درِ شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، اُدھر آیا۔ اُس ملک کا یہ دستور تھا: جب بادشاہ عازمِ اقلیمِ عدم ہوتا، ارکانِ سلطنت، روسائے شہر وہاں آ کر باز اُڑاتے تھے۔ جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے، ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہِ گدا صورت کا پہنچنا، باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے، تخت روبہ رو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا: میں گم کردۂ آشیاں سلطنت کے شایاں نہیں ہوں۔ میں نے اسی علت سے اپنے مرزبوم شوم کو چھوڑا ہے، حکومت سے منہ موڑا ہے مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا، عنقا سمجھ، نہ باز رہے۔ جو جو شاہین تھے تاڑ گئے، پر بیں پہچان گئے کہ یہ مقرر ہُمائے اوجِ سلطنت ہے۔ قصہ مختصر، رگڑ جھگڑ تختِ طاؤس پر بٹھا نذریں دیں، توپ خانے میں شلک ہوئی۔ بڑے تُزک، حشمت سے آشیانۂ سلطنت، کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قلمرو، نقد و جنس، اشیائے بحری و بری ان کے تحت حکومت، قبضۂ تصرف میں آیا۔ گز، سکے پر نام جاری ہوا۔ منادی نے ندا دی، دہائی پھر گئی کہ جو ظلم و جور کا بانی ہوگا، وہ لٹورا، گردن مارا جائے گا، سزا پائے گا۔ سوز:

پل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں
کچھ اچنبھا نہیں اس کا کہ خدا قادر ہے [2]

۱۔ "اے صبا! قافلے والوں سے کہنا کہ اگر تمھاری یہی رفتار ہے تو ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔"

۲۔ "وہ (اللہ تعالیٰ) اگر چاہے تو پل بھر میں فقیر کو بادشاہ بنا دے اور یہ کام کوئی حیران کن بھی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شے اور ہر فعل پر قدرت حاصل ہے۔"

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں، نہ اعتمادِ سلطنت، نہ قیامِ غربت و عسرت۔ مرزا رفیع:

عجب نادان ہیں، جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی
فلک، بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی[1]

یہ سلطنت تو کرنے لگا مگر فسردہ خاطر، پژمردہ دل۔ بہ سبب شرم و حیا مفصل حال کسی سے نہ کہتا تھا، شب و روز غمگین و اندوہ ناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بلبلِ ہزار داستاں یعنی فرزندِ شمعِ دودماں یاد آتے تھے، دن کو پیشِ چشم اندھیرا ہو جاتا، ظلِ سبحانی کو، کو، کر کے نالہ و فریاد مچاتے تھے۔

(فسانۂ عجائب)

ا۔ یہ شعر سودا کا ہے جس کا مطلب ہے" وہ عجیب طرح کے بے وقوف لوگ ہیں جو شاہی تاج یعنی اقتدار پر تکبر کرتے ہیں۔ آسمان (زمانہ) اگر چاہے تو پل بھر میں ہما کے پر کو (جسے بادشاہوں کے تاج میں ہونا چاہیے) مکھیاں اڑانے کی خدمت سونپ دے۔"

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- یمن کے بادشاہ کو لوگ "خدادوست" کیوں کہتے تھے؟
ii- بادشاہ نے کیا کہ کر اپنی سلطنت سائل کو دے ڈالی؟
iii- بادشاہ کے دونوں بیٹوں پر کیا گزری؟
iv- بادشاہ کو دوسرے ملک کی بادشاہت کس طرح مل گئی؟

2- درست بیان کے سامنے (✓) اور غلط بیان کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- "فسانۂ سلطانِ یمن" فسانۂ عجائب کا اقتباس ہے۔
ii- "فسانۂ عجائب" حیدر بخش حیدری کی تصنیف ہے۔
iii- "فسانۂ عجائب" کی زبان پر تکلف ہے۔
iv- "فسانۂ عجائب" میں پنجاب کا ماحول پیش کیا ہے۔

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا۔
ii- تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر۔
iii- جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔
iv- کنارے پر دریا کے خاک اڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہی بے آب سا واہی تباہی پھرا۔

4- قافیہ دار عبارت یعنی جس میں قافیوں کا استعمال ہو، مقفّیٰ عبارت کہلاتی ہے۔"فسانۂ عجائب" میں بے شمار مقفّیٰ جملے ہیں۔ مثلاً ملک اس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندۂ بخت۔"
اسی طرح کے پانچ اور مقفّیٰ جملے "فسانۂ عجائب" کے پڑھے ہوئے حصے میں سے منتخب کر کے لکھیں۔

5- "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کے اقتباسات آپ نے پڑھے۔ بتائیں ان میں زبان و بیان کا واضح فرق کیا ہے؟

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں:

بخشندۂ تاج و تخت، موردِ عتابِ سلطانی، ثروت، اذیت۔

☆......☆......☆

ناول

ناول (Novel) اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نئی یا انوکھی چیز کے ہیں۔فنی اصطلاح میں اس سے مراد ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمول کے واقعات اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دل چسپی پیدا ہو۔یہ دل چسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ان میں پلاٹ اور کردار نگاری خاص طور پر اہم ہیں۔

ناول میں پلاٹ ایک نقشے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ناول نگار کرداروں اور مکالموں وغیرہ کے ذریعے سے رنگ بھرتا ہے۔ناول کی کامیابی کا بڑا انحصار ناول کے پلاٹ پر ہوتا ہے جس پر پورے ناول کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ پلاٹ کے آغاز میں ناول نگار اپنے کرداروں اور واقعات کا تعارف دل چسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں کرتا ہے۔ پلاٹ کے دوسرے حصے میں واقعات یا کرداروں میں تصادم رونما ہوتا ہے جو واقعات کو نقطۂ عروج پر لے جاتا ہے۔ تیسرے حصے میں واقعات اس حد تک الجھ جاتے ہیں کہ وہ قاری کی توجہ اور جذبات کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ خواہش کرنے لگتا ہے کہ ان الجھنوں کا جلد فیصلہ ہو۔ چوتھے حصے میں واقعات کی الجھنیں ختم ہونے لگتی ہیں اور آخری حصے میں ناول اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

جس طرح ناول میں کچھ واقعات کی ضرورت ہوتی ہے جو اشخاص کو پیش آئیں، اسی طرح ناول میں کچھ اشخاص کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کو بعض واقعات پیش آئیں۔ چونکہ ناول انسانی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، اس لیے اس کے کردار بھی عام انسان ہوتے ہیں جن میں اچھے اور برے سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ناول کے کرداروں کو مثالی نہیں ہونا چاہیے بلکہ حقیقت کے قریب ہونا چاہیے۔

اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے کرداروں کی گفتگو کو مکالمہ کہتے ہیں۔اچھے ناول نگار کے کردار اُسی طبقے کی زبان بولتے ہیں جس طبقے سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ان پڑھ مزدور اگر عالموں فاضلوں جیسی گفتگو شروع کر دے تو اسے مکالمے کا عیب سمجھا جائے گا۔کرداروں کے مکالموں کا مختصر، چست اور موثر ہونا ضروری ہے کیونکہ مکالمے اگر طویل ہوں گے تو ان پر تقریر کا گمان ہوگا۔

ناول نگار کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے جسے وہ ناول میں بیانیہ انداز میں یا کرداروں کی گفتگو کے ذریعے سے اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ناول پڑھتے ہوئے قاری کو ناول نگار کے مستور فلسفۂ حیات سے آگاہ ہونے کا موقع ملتا ہے لیکن ناول نگار کو براہِ راست خطاب کرنے یا وعظ کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ قاری اس سے اچھا تاثر نہیں لیتا۔

منظر نگاری بھی ناول کے عناصر ترکیبی کا ایک اہم جز ہے کیونکہ بعض مناظر واقعات کو مؤثر بنانے اور کرداروں کی شخصیت کو واضح کرنے میں اہم پس منظر فراہم کرتے ہیں۔اچھا ناول نگار اپنے ناول کے مختلف مناظر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی مکمل تصویر آ جاتی ہے۔اس کے علاوہ ناول میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے ناول نگار کو تجسس کا سہارا بھی لینا چاہیے۔مزید براں ناول کی کہانی میں چونکہ ایک سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں اس لیے ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ ان واقعات میں منطقی ربط قائم رکھے۔

اردو ادب میں ناول کی صنف انگریزی کے توسط سے آئی۔ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کے بعد رتن ناتھ سرشار نے ''فسانۂ آزاد'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ عبدالحلیم شرر اپنے تاریخی ناولوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر ناول میں حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی۔ پریم چند نے ناول لکھ کر اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔کرشن چندر کا ''شکست''، عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر''، عزیز احمد کا ''گریز'' اور شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' ناول نگاری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی بہت سے اچھے ناول لکھے گئے جن میں قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، جمیلہ ہاشمی کا ''دشتِ سوس''، فضل احمد کریم فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک''، عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' اہم ہیں۔

مرزا ہادی رسوا

سالِ ولادت: ۱۸۵۸ء **سالِ وفات: ۱۹۳۱ء**

مرزا رسوا لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام مرزا ہادی اور قلمی نام رسوا تھا۔ وہ نسلاً مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جدِّ امجد ایرانی شہر ماژندران سے قسمت آزمائی کے لیے نقل مکانی کر کے دہلی چلے آئے اور شاہی فوج سے منسلک ہو گئے۔ دہلی کے اجڑنے کے بعد ان کے صاحبزادے نے فیض آباد اور فیض آباد سے لکھنؤ کا رخ کیا۔

مرزا رسوا کے والد کا نام آغا محمد تقی تھا۔ وہ ایک فوجی عہدہ دار تھے اور فارسی، نجوم اور ہندسہ کے علوم پر عبور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسوا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور عربی، فارسی، حساب، طب، نجوم، منطق، فلسفہ اور انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں رڑکی کالج سے اوورسیری کا امتحان پاس کر کے مختلف جگہوں پر ملازمت کی مگر مزاج کی ناموافقت کے باعث ملازمت ترک کر کے پڑھانے کا شغل اپنالیا۔ اُنھوں نے کئی جرائد بھی جاری کیے۔

۱۸۸۸ء میں لکھنؤ میں ریڈ کرسچین کالج کے قیام کے بعد وہاں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں دار الترجمہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے اور متعدد انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم کو امریکہ بھیجا جن کی بنا پر اُنھیں پی ایچ ڈی اور ڈی ایس او کی ڈگریاں ملیں۔

رسوا نے انگلستان سے کیمیا کے آلات منگوا کر ان پر تجربات کر کے کیمیا کی تعلیم بھی حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں بھی کام کیا۔ بالآخر ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ۷۲ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

مرزا رسوا ایک بہت اچھے ناول نگار ہونے کے ساتھ ایک خوش فکر اور زود گو شاعر بھی تھے۔ ناول نگاری ان کی وجہِ شہرت ہے۔ ''افشائے راز''، ''ذاتِ شریف''، ''شریف زادہ'' اور ''اختری بیگم'' ان کے بہترین ناول ہیں۔ یہ تمام طبع زاد ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی ناول بھی اُردو میں ترجمہ کیے۔ مرزا رسوا کی وجہِ شہرت ان کا ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے۔ یہ اپنے زمانے کا مقبول عام ناول تھا جو اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔

''امراؤ جان ادا'' کی عبارت اور زبان دانی اس ناول کا نمایاں وصف ہے۔ یہ ایک نہایت منظم، مربوط اور باقاعدہ ناول ہے۔ اس کی کردار نگاری اس قدر شان دار ہے کہ تمام کردار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ گویا یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ منظر نگاری اتنی پرکشش ہے کہ تمام واقعات و حقائق ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔

''امراؤ جان ادا'' کے کردار کی تخلیق میں رسوا کی فنی بصیرت پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کردار کے ذریعے سے رسوا نے اس وقت کی زوال پذیر معاشرت کی سیر کرائی ہے۔

امراؤ جان ادا

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی ؟

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھونپڑے۔ رہنے والے بھی ایسے ویسے ہی لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابا ابا کر کے دوڑا' دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا' پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھا لیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو' کتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا[1] چھینے لیے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے۔ "ابا گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا۔ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی' ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی' سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے۔ نماز پڑھی۔ اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی۔ پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

"میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا......"

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔ کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیونکہ ابا پہر دن چڑھے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پرونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی۔ ہجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے بھیا کو بٹھا دیا۔ خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ کیا دن تھے۔ کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیوں کہ ہجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا[2] میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل[3] پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا۔ دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھپریل، دو

۱۔ ایک قسم کا پتلا گنا جس سے رس نکال کر گڑ بناتے ہیں۔ ۲۔ کٹیا، جھونپڑی ۳۔ کھپروں سے بنائی ہوئی چھت۔ کھپرا مٹی کے ٹھیکرے کو کہتے ہیں۔

کوٹھریاں کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا۔ محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھرلاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے تو لوگ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں۔ ہمسائیاں پاؤں پاؤں، پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

میں صورت شکل میں بھی اپنی ہجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہوسکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں[1] نہ تھی مگر چپٹی اور پھیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اُس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائجامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں[2] کاٹول کا نیفہ، نینو[3] کی کرتی، تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پُرا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع، دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی، دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت، بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے۔ کوئی کہاں تک کھائے!

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چنداڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا، موا چاندی کا تھا، شاید ایک آنہ[4] سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے اتنا روئی کہ آنکھیں سُوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انھوں نے انگلی خالی دیکھی مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انھوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگالیا۔ گود میں اٹھالیا۔ پیار کرلیا۔ جب دیکھا اماں

۱۔ ستواں۔ پتلی ۲۔ ایک قسم کا کپڑا جس کی بناوٹ کھیس جیسی ہوتی ہے۔ ۳۔ ایک قسم کا باریک سوتی کپڑا جس پر آنکھ کی طرح تارے تارے ہوتے ہیں۔
۴۔ آنے سے (اب اس طرح لکھا جانا چاہیے)

آتی ہیں جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا۔ لگیں گھرکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا سب گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ ''اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلوا دو۔'' گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے۔ باقی نکال کے الگ کر دیے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا اوہ جی ہو گا۔ تمھاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں۔ وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمھاری بہن ہیں۔ سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی[1] جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت واتفاق نے مجبور کر[2] ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

(امراؤ جان ادا)

ا۔ جس کے پاس زیور نہ ہوں ۲۔ مجبور کر کے (اب اس طرح لکھا جائے گا)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں۔

i- امراؤ جان ادا کہاں کی رہنے والی تھی؟

ii- دلاور خان کون تھا؟

iii- امراؤ جان ادا کی شکل وصورت کیسی تھی؟

iv- امراؤ جان ادا کی منگنی کس سے ہوئی تھی؟

v- امراؤ جان ادا انگلی کا چھلا گم ہو جانے کا واقعہ کیوں چھپا رہی تھی؟

vi- کیا امراؤ جان ادا اپنے ماں باپ کے گھر میں خوش تھی؟

2- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب سے پہلے (✓) کا نشان لگائیں:

i- ''امراؤ جان ادا'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

ا۔ میر امن	ب۔ مرزا رسوا
ج۔ رجب علی سرور	د۔ حیدر بخش حیدری

ii- مرزا رسوا کا تعلق کس شہر سے تھا؟

ا۔ لاہور سے ب۔ دہلی سے

ج۔ لکھنؤ سے د۔ علی گڑھ سے

iii- مرزا رسوا کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ا۔ شاعری ب۔ مضمون نگاری

ج۔ افسانہ نگاری د۔ ناول نگاری

iv- مرزا رسوا نے اردو کے علاوہ کس زبان میں لکھا؟

ا۔ انگریزی میں ب۔ پنجابی میں

ج۔ سندھی میں د۔ بلوچی میں

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

i- باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں۔

ii- اگر چہ در حقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہوسکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔

iii- مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت واتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

iv- جہاں میری انگلی دکھی اماں بے قرار ہو گئیں۔

4- امراؤ جان ادا نے اپنے بچپن کے بارے میں جو کچھ بتایا' اپنے الفاظ میں لکھیں۔

5- ''تنقید'' کا مطلب ہے: ''تبصرہ، نکتہ چینی، جانچ، پرکھ'' ادب میں اس سے مراد ہے کسی تحریر پر اس طرح بحث کرنا کہ اس کی خوبیا اور خامیاں قاری کے سامنے آجائیں۔

اب آپ مرزا رسوا کی تصنیف ''امراؤ جان ادا'' پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں:

ننگی بوچی، بخت و اتفاق، آپ بیتی، ناشدنی، چمکارا، قیاس

☆☆......☆☆......☆☆

شوکت صدیقی

سالِ وفات: ۲۰۰۶ء

شوکت صدیقی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں ایم۔ اے سیاسیات کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ لاہور آئے لیکن بعد میں مستقلاً کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔

اُنھیں ادبی ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ چنانچہ شوکت صدیقی کا رجحان شروع ہی سے ادب کی طرف تھا۔ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ افسانوں کے پہلے مجموعے ہی نے انھیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے میدانِ صحافت میں قدم رکھا۔ اُنھوں نے مختلف اخبارات میں کام کیا جن میں ''ٹائمز آف کراچی''، ''مارننگ''، ''مشرق'' اور ''مساوات'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ ''مشرق'' میں انھوں نے کالم نویسی بھی کی۔

۱۹۵۹ء میں وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے ممبر بنے۔ اسی سال انھیں ''پروگریسو رائٹرز موومنٹ'' کا صدر بھی بنا دیا گیا۔

افسانہ نگاری، فن صحافت اور کالم نویسی کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ پائے کے ناول نگار بھی ہیں۔ یوں تو اُنھوں نے تین ناول لکھے اور تینوں ہی اُردو کے عمدہ ناول ہیں مگر ان کی وجہِ شہرت ان کا ناول ''خدا کی بستی'' بنا بلکہ قارئین تو بالعموم اُنھیں اسی کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔

ان کی تصانیف میں ''تیسرا آدمی''، ''اندھیرا اور اندھیرا''، ''خدا کی بستی''، ''کیمیا گر''، ''جانگلوس'' اور ''چار دیواری'' شامل ہیں۔

شوکت صدیقی کو ۱۹۹۷ء میں ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ''تمغۂ حسنِ کارکردگی'' ملا۔ ۲۰۰۱ء میں عمر بھر کے مجموعی کام کے اعتراف کے طور پر اُنھیں پاکستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' ملا جس کے ساتھ پانچ لاکھ روپے کا نقد انعام بھی دیا جاتا ہے۔

شوکت صدیقی کثیر الجہات ادیب ہیں اور بر یک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نویس اور صحافی کی حیثیت سے اُردو ادب میں اپنا نام اور مقام پیدا کر چکے ہیں۔

شوکت صدیقی کی تحریروں کی کامیابی کا راز حقیقت پسندی ہے۔ وہ معاشرے کے حقائق اور مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔ زبان و بیان کے حوالے سے وہ نہایت سلجھی ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں ان کی جائے پیدائش لکھنؤ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

شوکت صدیقی کی کردار نگاری بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے کردار معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جو جامد اور مثالی نہیں بلکہ ان میں حقیقی زندگی کے تمام رنگ ملتے ہیں۔ یہ کردار ہم اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' کے کردار ہیں۔ ان کے ہاں مکالمہ نگاری، جذبات نگاری اور منظر کشی کے بہترین مرقعے ملتے ہیں۔

شاملِ کتاب اقتباس ان کے مقبول ترین ناول ''خدا کی بستی'' سے لیا گیا ہے۔ یہ ناول ایک سیریل کی صورت میں ٹیلی کاسٹ بھی ہو چکا ہے۔

شوکت صدیقی

خدا کی بستی

ستمبر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی کیس لٹک رہا تھا۔ لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔

اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی اور نہ ہی کسی نے توجہ دی۔ گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی ممتا بلک اٹھی۔ وہ اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ چند لمحے اس کے چاروں طرف ہجوم رہا، پھر ہر شخص خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ باپ ملازمت سے ریٹائر ہو کر پنشن پر آ گیا تھا۔ اس نے لمبی ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے پانچوں وقت نماز پڑھتا، کلامِ پاک کی تلاوت کرتا اور رات کو تہجد بھی پڑھتا، خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا اور دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ہمیشہ افسرانِ بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے سوا تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان نالائق رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیل دار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی مگر اب کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیا کترا کرتی۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا۔ اس لیے کہ وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑپن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن یہی ایک ایسا وقت ہوتا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔

جب بھی گھر میں مہمان آتے تو اکثر یہی ڈراما ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مہمانوں کی آمد سے قبل ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا۔ سو سو طرح سے اس کی خوشامد ہوتی، بار بار ہدایتیں دی جاتیں اور منت سماجت کر کے اسے کمرے میں بند کر دیا جاتا مگر یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا، اس لیے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا یہ اقدام بہت ہی خطرناک ہوتا تھا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی جس کے سپرد ان دنوں خانہ داری کا سارا انتظام و انصرام تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اس نے ماں کے حق پر ڈاکا ڈالا تھا جسے وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس حق سے محروم ہونے کے بعد اس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے بدتر ہو گئی تھی۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی۔ اس نے فلسفے میں ایم۔اے کیا تھا لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی اور وہ فلسفہ یہ تھا کہ کسی گزیٹڈ آفیسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ گزیٹڈ آفیسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی سکالرشپ کے لیے کوشاں تھی۔ ان دنوں اس کے سر پر یہی دھن سوار تھی۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سرتاپا تصنّع تھا۔ اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی۔ اس کی بیوی گریجویٹ تھی لہٰذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بنتا جا رہا تھا۔ وہ سویرے اٹھ کر بیڈ ٹی پیتا' ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا۔ وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز پیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اسے بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا۔ وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ جنھیں پورا کرنے کے لیے وہ رشوت خوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اسے بڑا آدمی سمجھا جائے۔

چھوٹا بھائی بی۔اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں جتا رہتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ کسی طرح سی ایس پی بن جائے۔ شاندار بنگلا، چمکتی کار، ''اردلی'' اور ''سر'' کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی بینائی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔

سلمان کئی برس بعد آیا تھا اور ان کئی برسوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ سلمان اس لیے گھر آیا تھا کہ اس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا اس میں کمی آ جائے گی مگر ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹائی فائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر پر پڑا رہا۔ یہ اس کی زندگی کا اذیّت ناک دور تھا۔ اس کے بھائی بہنوں کا رویہ افسوس ناک تھا۔ کوئی اس کے قریب آ کر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح کتراتے جیسے وہ مجسم ٹائی فائیڈ کی بلا بن گیا تھا جو قریب آتے ہی ان سے چمٹ جاتی۔

سب مل کر قہقہے لگاتے' فلموں پر تبصرے کرتے، لباسوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث کرتے مگر کوئی اس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ چھوٹا بھائی سلمان کے لیے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آ کر اس قدر احسان جتایا تھا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آ جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور الٹے قدموں واپس چلی جاتی۔

ایک ماں کی مامتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور اکثر ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا دیتی' اس کا سر دباتی' بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اسے تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے قرار ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگتی۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لیے دوا بھی قرض پر آ رہی تھی۔ وہ موسمی کا رس پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اسے بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمیاں منگوانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو ٹالتی رہی، پھر اپنی مجبوری پر رو پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدّت کے ساتھ احساس ہوا۔

لیٹے لیٹے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک بیمار افسر کی عیادت کے لیے ہسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل جن میں

سرخ سرخ موسمیاں بھی شامل تھیں اسے پیش کرنے کے لیے بطورِ خاص منگوائے گئے تھے۔ سلمان نے سب کچھ خاموش نظروں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کر رہ گیا۔

باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر سلمان کے کمرے میں بھی آتا۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا۔ کلائی تھام کر نبض دیکھتا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سرہانے کھڑا زیرِ لب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔ جب وہ آتا' سلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں بے بسی اور مظلومیت جھلکتی۔

سلمان خاموش لیٹا سوچتا رہتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بدقسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں سر کھپاتے گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دس دس بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھایا۔ اس نے زائد سے زائد مشقت کی، کم سے کم خرچ اور زائد سے زائد پس انداز کیا اور یہ سب کچھ اس نے صرف اس لیے کیا کہ اس کی اولاد کا مستقبل روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپے جو اس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمائے تھے' اولاد کی تعلیم پر لگا دیے۔ اس کی تعلیم یافتہ اولاد اور ان پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اس سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بہن بھائی سرگرداں تھے لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان پڑھ کباڑیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی' کار اور بینک بیلنس جیت کے تین کارڈ اس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

سلمان کو نیاز سے نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اسے اس لیے نظرِ حقارت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگریٹ نہیں پی رہا تھا' شاندار سوٹ نہیں پہنے تھا' اس کے پاس کار نہیں تھی۔ وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ ان کی زندگی سنوارنا چاہتا تھا اور اس کے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ' کوئی منصب' ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔ بینک بیلنس کیوں نہ بڑھایا؟ ان کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخرا پن تھا۔ سراسر حماقت تھی اس لیے کہ وہ بلندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھیں مطلق احساس نہ تھا کہ نیچے کروڑوں ننگے بھوکے' کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہیں جو ان ہی کی طرح انسان ہیں جن کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں ہیں۔ وہ اپنی تحقیر اور ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد سلمان کی ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کرے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کی زندگی ہی میں وہ اپنا گھر بسا لے۔ یہ پروگرام دراصل اس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعے سے اس نے سلمان تک پہنچایا تھا۔ متوسط طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اسے بھی سلمان کو راہِ راست پر لانے کا ایک ہی مجرب نسخہ سمجھ میں آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا۔ مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے، باپ کا انتقال ہو چکا ہے، چچا نے اولاد کی طرح اسے پالا پوسا ہے وہ پانچ ہزار روپیا نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوا دے گا تو یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

چند روز تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ شادی پر رضامند ہو گیا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذہن گویا گیلی مٹی تھا جسے وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ دلکش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار نقد ملے تھے اور ملازمت کے لیے چچا نے حسبِ وعدہ کوشش شروع کر دی تھی۔ شادی کے تیسرے ہی ہفتے ملازمت کا بندوبست ہو گیا۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اسی روز پہلی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

(خدا کی بستی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- سلمان کی آمد پر گھر والوں نے کس تاثر کا اظہار کیا؟
ii- ریٹائرمنٹ کے بعد سلمان کے باپ کی مصروفیات کیا تھیں؟
iii- سلمان کے باپ کو کس بات پر فخر تھا؟
iv- سلمان کی ماں کی گھر میں اب کیا حیثیت تھی؟
v- ماں کو سب سے زیادہ شکایت کس سے تھی؟

2- درست بیان کے سامنے (✓) اور غلط بیان کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- ''خدا کی بستی'' کے مصنف کا نام شوکت صدیقی ہے۔
ii- ''خدا کی بستی'' ایک افسانہ ہے۔
iii- شوکت صدیقی نے شاعری بھی کی۔
iv- شوکت صدیقی کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔
v- شوکت صدیقی مستقل طور پر لاہور میں آباد ہوئے۔

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔
ii- ایک ماں کی مامتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔
iii- اس کے بہن بھائی اس لیے اُسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ، کوئی منصب ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔
iv- اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی اور نہ ہی کسی نے توجہ دی۔
v- کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی مگر اب کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

4- سبق کے حوالے سے خالی جگہیں پر کریں:

i- وہ اپنی..................کو سرکش اور بد تمیز سمجھتی ہے۔
ii- جب گھر میں..................آتے تو اکثر یہی ڈراما ہوتا۔
iii- سلمان کی بڑی..................لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی۔
iv- ان دنوں اس کے..................پر یہی دُھن سوار تھی۔
v- اس کی صرف ایک خواہش تھی کہ اسے..................آدمی سمجھا جائے۔

5- مصنف نے سلمان کی زندگی کے اس دور کو اذیّت ناک قرار دیا ہے۔ کیوں؟ وضاحت سے لکھیں۔

6- ''خدا کی بستی'' کا جو اقتباس آپ نے پڑھا ہے اس کا خلاصہ لکھیں۔

7- ''خدا کی بستی'' کے حوالے سے شوکت صدیقی کے اسلوبِ تحریر پر نوٹ لکھیں۔

8- ''خدا کی بستی'' میں ماں باپ کا جو کردار نظر آتا ہے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

خدیجہ مستور

سالِ ولادت: ۱۹۲۷ء **سالِ وفات: ۱۹۸۲ء**

خدیجہ مستور بریلی کے یوسف زئی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ خدیجہ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں کی فضا علمی و ادبی تھی۔ ان کے والد تہور خان ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ والدہ انور جہاں اس دور کی اچھی شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں سکول میں داخل ہوئیں۔ دو برس بعد والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کوئی بھائی بھی نہ تھا جو کفالت کرتا لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ خاندان نے کفالت کا ذمہ لینے سے انکار کر دیا تو انھیں اپنے نانا کے پاس بمبئی جانا پڑا جہاں گھر پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ زندگی دکھوں اور مشکلات سے ہمکنار رہی مگر علمی و ادبی ماحول نے ان کی ڈھارس بندھائے رکھی۔

علم دوستی اور ادب شناسی نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور یوں محنت، لگن اور ذوق و شوق نے ایک حساس شخصیت کو ادیبہ بنا دیا۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور زندگی کے تجربات نے انھیں ادب کے قریب کر دیا۔ انھوں نے ان تجربات کو اپنی تحریروں میں سمونا شروع کر دیا۔ ان کی بہن حاجرہ مسرور کی طرف سے بھی ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء سے اپنی نگارشات باقاعدہ طور پر رسائل میں بھیجنا شروع کر دیں۔ ان کی ابتدائی دور کی کہانیاں اپنے وقت کے ادبی رسائل ''خیال'' اور ''عالمگیر'' میں شایع ہوئیں۔ جلد ہی ان کا شمار ادیبوں میں ہونے لگا اور ادبی دنیا انھیں اہمیت دینے لگی۔

۱۹۴۵ء میں سید احتشام حسین نے ریڈیو کی نشری تقریر میں خدیجہ کی ایک کہانی کی تعریف کی تو عام قارئین تک ان کا نام پہنچا۔ قارئین نے بھی اس کی تحریروں کو پسند کیا جس نے خدیجہ میں اعتماد، ہمت اور حوصلے کو جلا بخشی۔ ۱۹۵۰ء میں ظہیر بابر سے ان کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی ان کا ادبی ذوق قائم رہا۔ وہ بہت سے رسائل کی مدیر بھی رہیں۔ ہجرت کے بعد ان کا قیام لاہور میں رہا اور یہیں اُن کا انتقال ہوا۔

''بوچھاڑ''، ''تھکے ہارے''، ''ٹھنڈا میٹھا پانی''، ''چند روز اور'' اور ''کھیل'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول نگاری میں بھی نام پیدا کیا بلکہ ناول نگاری ہی ان کی وجہِ شہرت بنی۔ ''زمین'' اور ''آنگن'' ان کے مشہور ناول ہیں۔ ''آنگن'' پر انھیں آدم جی ادبی انعام ملا۔ ''زمین'' ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

ان کی تحریروں میں حقیقت نگاری کا فن نمایاں ہے۔ جس نے ان کے فن کو ادب کی دنیا میں ایک وقار اور اعتماد بخش کر اعلیٰ ادیبہ کا درجہ دیا۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، سہا اور محسوس کیا اس کو چھپایا نہیں بلکہ اپنی تحریروں میں سمو دیا۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں تفصیل نگاری اور انسان دوستی کا وصف بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے جزئیات اور تفصیل نگاری کی صلاحیت سے اپنی تحریروں کے ذریعہ زندگی اور معاشرے کے بہت سے مسائل پر بھرپور توجہ دی۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام تجربات کو اپنی تحریروں میں سمو دیا ہے۔ انھوں نے کردار نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی۔ خاص خوبی یہ ہے کہ ان کے کردار تخیلاتی یا ماورائی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے کردار ہیں جن کی نفسیات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان کرداروں سے کہانی کا جو تانا بانا وہ بنتی ہیں اس سے ہمارے معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے۔

خدیجہ نے جن کٹھن حالات میں زندگی گزاری، اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی تحریروں میں غم و اندوہ اور ہاتھوں کو زخمی کرنے والے کانٹے ہوتے، مگر ان کی تحریروں میں محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور دل کو چھو لینے والا سوز ملتا ہے، جو ہر اہلِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ زبان و بیان پر قدرت، ذخیرۂ الفاظ اور سلیقۂ استعمال نے ان کی تحریروں کو مؤثر بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک خاص چمک، تیکھا پن اور ہمہ رنگی ملتی ہے جو ان کے کسی ہم عصر کی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ گویا انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی ذہانت اور فنی صلاحیت کا لوہا منوالیا۔

شاملِ کتاب ناول ''آنگن'' ان کی وجہِ شہرت بن گیا۔ یہ ناول ''تحریکِ پاکستان'' کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ناول کی تمام بنیادی خصوصیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ ایک خاندان کی کہانی ہے مگر اس کے تمام کردار سیاسی و سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں اور جن کرداروں کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے وہ محض گوشت پوست کے پتلے نہیں بلکہ احساسات و جذبات بھی رکھتے ہیں۔

خدیجہ مستور

آنگن

فساد ختم ہو گئے تھے۔ بس کہیں اکا دکا واردات کی خبر پڑھنے میں آ جاتی۔ اب دونوں ملک بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے۔ عالیہ کو ان خبروں سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ بھلا ایسی بھی معصومیت کس کام کی!

خالی وقت گزارنے کے لیے اس نے والٹن کیمپ جانا شروع کر دیا تھا۔ سکول سے آ کر وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بس سے چلی جاتی۔ وہاں بچوں کو مفت میں پڑھا کر اسے عجیب سا سکون ملتا۔ مصروفیت کی دُھول نے پچھلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

اماں اس کے والٹن کیمپ جانے کی وجہ سے سخت اُکھڑی اُکھڑی رہتیں۔ جب بھی وہ وہاں سے واپس آتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی۔ ایسے موقع پر وہ چپ رہتی۔ وہ اپنی طرف سے بات نہ بڑھانا چاہتی تھی۔

آج چھے بجے شام جب وہ واپس آئی تو اماں اُجاڑ لان میں کرسی پر بیٹھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں...... ''تم وہاں کس لیے جاتی ہو؟ تم کو اس بیکار کام میں کیا مل جاتا ہے؟'' انھوں نے سختی سے سوال کیا۔

''سکون ملتا ہے۔'' اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

''وہی باپ اور چچا والی باتیں' کیا اب تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟''

''بچوں کو پڑھانے سے اگر آپ تباہ ہوتی ہیں تو میں مجبور ہوں۔'' اس نے تنگ آ کر جواب دیا۔

''تم مجبور ہو؟'' اماں نے غصے سے پوچھا۔

''ہاں میں مجبور ہوں۔'' وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اماں پلو میں منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔

کمرے میں تنہا پڑ کر وہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اماں کو خوش نہیں رکھ سکتی' انھیں خوش رکھنے کے لیے اسے اس پرائے گھر میں پڑا رہنا ہوگا۔ تنہائی اور بیکاری میں جو جذبے اسے ستائیں گے، ان سے کس طرح پیچھا چھڑائے گی' اور جو یادوں کے بھُوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں ان سے بچ کر وہ کہاں بھاگے گی۔ وقت یوں نہیں گزر سکتا' اسے سہارے کی ضرورت ہے اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی جانے کیسے اس کو والٹن کیمپ کے ڈاکٹر کا خیال آ گیا۔ اچھا آدمی ہے بیچارہ۔

رات اماں نے اکیلے کھانا کھا لیا۔ اس نے بھی شکایت نہ کی۔

آج جب وہ سکول سے واپس آئی تو اُداس تھی۔ آپ ہی آپ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جی بیٹھا جا رہا ہے۔ سردیاں دم توڑ رہی تھیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سخت سردی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ آج وہ آرام کرے گی' آج کہیں نہ جائے گی۔

کھانے کے بعد کمرا بند کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کتنی دیر کروٹیں بدلتی رہی مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اُکتا کر اُس نے اخبار اُٹھا لیا۔ آج تو صبح جانے سے پہلے اُس نے اخبار کو سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا۔ جی ہی نہ چاہا۔

تین موٹی موٹی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں...... مشہور مسلمان کانگرسی لیڈر کو کسی شخص نے مار دیا۔ نہرو کا اظہارِ افسوس' مرحوم کے خاندان کے لیے تین ہزار روپیا کا عطیہ۔ ہندو مسلمان منافرت کی شدید مذمت......

بڑے چچا کا نام پڑھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُٹھی اور پھر اپنے بستر پر گر پڑی۔ اسے اپنے دل میں درد سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ارے وہ تو بڑے چچا سے مل کر بھی نہ آئی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ...... وہ اپنے پلنگ کی پٹی سے سر پٹک پٹک کر بڑی دیر تک روتی رہی' اب وہ بڑے چچا سے کبھی نہ مل سکے گی۔ اس احساس نے اسے اس بُری طرح تڑپایا کہ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی تھی۔

شام ہوگئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ روتے روتے وہ تھک چکی تھی۔ اماں کئی بار دروازہ کھٹکھٹا کر لوٹ چکی تھیں۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل کھولا اور کمرے میں بکھرے ہوئے اخبار کے صفحوں کو روندتی باہر نکل گئی۔

''ارے تم کو کیا ہوا ہے؟'' اماں اس کے سرخ چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

''بڑے چچا کو کسی ہندو نے چپکے سے مار دیا۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔ اتنا رو چکنے کے بعد اسے جیسے صبر آ گیا تھا۔

''ہے ہے' ساری زندگی ہندو کی غلامی کرنے کے بعد یہ بدلہ ملا؟'' اماں کی آواز بھرّا رہی تھی۔ انھوں نے پلّو میں آنسو خشک کر لیے ...... ''ہے بے چاری بڑی بھابی کا کیا حال ہوگا' انھوں نے تو ہم لوگوں کو اطلاع تک نہ دی۔''

عالیہ اماں کو ان کے حال پر چھوڑ کر باہر لان میں چلی آئی ...... بس بڑے چچا! اتنی شاندار زندگی کا یہی انجام ہونا تھا؟ ...... تین ہزار روپے کا عطیہ اور اظہارِ افسوس؟' پتا نہیں کپڑے کی دکانوں کے لیے بیس پچیس ہزار روپے ملے تھے یا نہیں؟ بجلی کا کنکشن بحال ہوا تھا یا نہیں؟ کیا اسی لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں بڑے چچا کی لاش رکھ کر سب روتے رہے ہوں گے؟ پتا نہیں جمیل بھیا کا کیا حال ہوگا؟ موت نے سارے اختلافات مٹا دیے ہوں گے کہ نہیں؟

رات لیمپ کی روشنی میں میز پر جھکی وہ بڑی دیر تک بڑی چچی کو خط لکھتی رہی اور اماں باتیں کرتی رہیں ...... جانے کیا حال ہوگا بڑی بھابی کا۔ بڑے بھیا مرحوم نے نہ زندگی بھر خود چین لیا نہ دوسروں کو لینے دیا۔ بھرے پرے گھر تباہ کر دیے' کیا مل گیا اُنھیں؟ جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی پردیس میں موت کی نیند سلا دیا۔ ہائے چلے ہی آتے، ان کافروں کے ملک سے۔ بھلا کیا ضرورت تھی وہاں رہنے کی۔ اور اب وہ جمیل میاں ہیں' وہ بھی ویسے ہی شاندار نکلے۔

خط ختم کر کے اس نے لفافے میں بند کر دیا۔

''سو جایئے اماں۔'' وہ لیمپ بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد اماں کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی مگر وہ آنکھیں کھولے اس اندھیرے میں کیا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی ...... یہ بڑے چچا کی کفنائی ہوئی لاش یہاں اتنی دور لا کر کون رکھ گیا۔ اسرار میاں تم بڑے چچا کو ہاتھ نہ لگانا' کریمن بوا ناراض ہو جائیں گی۔ کریمن بوا! اتنی زور زور سے قرآن شریف نہ پڑھو' موت کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے چچا نہیں مرے ایک دُنیا مر گئی' چپکے چپکے پڑھو کریمن بوا ...... اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر وہ اپنے کانوں کو کیسے بند کر لیتی۔ اتنی دور سے بڑے چچا کے ملک سے کریمن بوا کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز برابر آئے جا رہی تھی اور بڑی چچی کے بین کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔

''اے اللہ اس رات کو گزار دے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ پھر آخر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی' کیسی کیسی غلط کہاوتیں مشہور ہو گئیں اور آج تک کسی نے صحیح نہ کیں۔

صبح وہ اُٹھی تو تھکن اور صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دھوپ آ گئی تھی اور اماں مائی کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

وہ حسبِ معمول سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہ رہی ہوں کہ بھلا اتنے صدمے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ اماں اور مائی کے بے حد اصرار کے باوجود ناشتا کیے بغیر سکول چلی گئی۔

ایک بجے جب وہ سکول سے واپس آئی تو دھوپ میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر خود کو جیسے گرا دیا اور جب مائی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا تو وہ اس طرح کھانے لگی جیسے کڑوی روٹی نگل رہی ہو۔ اماں اب تک اپنے کام میں مصروف تھیں۔...... ''افوہ سارا دن گزر جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا' کوٹھیوں میں کتنا کام ہوتا ہے' مائی برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال دو۔ سُوکھے جا رہے ہیں''...... اماں برابر بولے جا رہی تھیں...... ''مائی تم نے کمرے میں میز پر کھانا کیوں نہیں لگایا؟ میز کرسی ہو تو آدمی کیا مزے سے کھانا کھاتا ہے' اپنے ہاں کا بھی کیسا بُرا رواج تھا کہ تخت پر بیٹھے کھا رہے ہیں۔''

آج مرے کل دوسرا دن' مرنے والے کو کون روتا ہے۔ آج اماں پر اپنے ہاں کے رواجوں کے عیبوں کا انکشاف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوٹھی نہ ملتی تو پھر یہ اتنے بہت سے راز کیسے کھلتے۔

کھانا کھا کر وہ والٹن کیمپ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں نے اسے مڑ کر دیکھا اور کوئی اعتراض کیے بغیر پھر کام میں مشغول ہو گئیں۔

(آنگن)

مشق

-1 مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- والٹن کیمپ جانے پر عالیہ کی امّاں کا رویہ کیا ہوتا تھا؟

ii- عالیہ نے اخبار میں کون سی اہم خبر پڑھی تھی؟

iii- بڑے چچا کو کس نے مارا تھا؟

iv- بڑے چچا کے قتل کی خبر پڑھ کر عالیہ کی کیا حالت ہوئی؟

-2 سبق کے حوالے سے خالی جگہ پر کریں۔

i- فساد............ ہو گئے تھے۔ (شروع، ختم)

ii- .... نے اکیلے کھانا کھایا۔ (ماں، باپ)

iii- .... لکھ کر اس نے لفافے میں بند کر دیا۔ (مضمون، خط)

iv- بڑے چچا کو کسی .... نے چھکے سے مار دیا۔ (مسلمان، ہندو)

v- خالی وقت گزارنے کے لیے اُس نے .... جانا شروع کر دیا۔ (والٹن کیمپ، سکول)

-3 سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

i- مصروفیت کی دھول نے پچھلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

ii- یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

iii- جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی موت کی نیند سلا دیا۔

iv- آج مرے کل دوسرا دن۔ مرنے والے کو کون روتا ہے؟

-4 آنگن کے حوالے سے عالیہ کے کردار پر بحث کریں۔

-5 آنگن کے حوالے سے خدیجہ مستور کے اسلوبِ تحریر پر نوٹ لکھیں۔

-6 ''آنگن'' کے کتاب میں شامل اقتباس کا خلاصہ لکھیں۔

-7 مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

دم توڑنا' موت کی نیند سلانا' کروٹیں بدلنا' جی بیٹھنا۔

☆......☆......☆

مختصر افسانہ

مختصر افسانہ انگریزی اصطلاح (Short Story) کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے لیے بالعموم افسانہ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی افسانوی صنفِ ادب ہے جس میں کسی خاص کردار، واقعے یا تجربے کے کسی ایک پہلو کو مکمل طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اسے ایک ہی نشست یعنی آدھ گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے میں پڑھا جا سکے۔

ناول نگار کی طرح افسانہ نگار کا موضوع بھی زندگی ہوتا ہے لیکن اپنی وسعتوں اور پیچیدگیوں سمیت نہیں بلکہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے، پوری زندگی کی بجائے صرف ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ افسانے کی کامیابی کا انحصار موضوع کی عمدگی پر ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو روزمرہ زندگی سے اپنا موضوع منتخب کرنا چاہیے۔

وحدتِ تاثر مختصر افسانے کی بنیادی شرط ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ افسانہ قاری کے ذہن پر ایک اور صرف ایک اثر چھوڑے جسے نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ کہانی میں دلچسپی کا مرکز ایک اور صرف ایک ہو ورنہ تاثر تقسیم ہو جائے گا اور اس کی شدت میں بھی کمی آ جائے گی۔ وحدتِ تاثر کا، اختصار کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ مختصر افسانے میں اختصار کے معنی یہ ہیں کہ ایسے تمام واقعات، بیانات، مناظر، مکالمے اور کرداروں کو کہانی میں شامل کرنے سے گریز کیا جائے جو وحدتِ تاثر کی راہ میں حائل ہوں اور قاری کی توجہ کو منتشر کرنے کا باعث بنیں۔ مثال کے طور پر افسانے میں زیادہ کرداروں کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ افسانے کا پلاٹ اور کہانی مختصر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو پورا افسانہ صرف ایک ہی کردار پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح مکالموں میں شاعرانہ تراکیب کے استعمال سے انھیں طوالت دینے کی گنجائش بھی افسانے میں نہیں ہوتی، اس لیے افسانہ نگار چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتا ہے۔

دلچسپی کا عنصر بھی افسانے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگر افسانے کی کہانی یا پلاٹ دلچسپ نہ ہو اور اس میں بھرپور تجسس نہ ہو تو قاری افسانے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ اسی طرح افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ افسانہ نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اُسے نہایت مختصر وقت میں قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے افسانے میں واقعات کی بھرمار نہیں ہوتی، نہ کرداروں کا تفصیلی مطالعہ ہوتا ہے اور نہ ہی طویل مکالمے ہوتے ہیں۔ گویا ہر پہلو سے ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر افسانہ بھی اردو زبان میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اردو افسانے کے اولین نمونے پیش کیے۔ علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی نے پریم چند کی ادبی روایت کو قائم رکھا۔ اس کے بعد حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کے علاوہ کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور ممتاز مفتی تقسیم سے قبل افسانے کی دنیا میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے نمایاں افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، غلام الثقلین نقوی، مسعود مفتی، قدرت اللہ شہاب، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، منشا یاد، انور سجاد، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ شامل ہیں۔

منشی پریم چند

سالِ ولادت:۱۸۸۱ء　　　　　　　　　　　　سالِ وفات:۱۹۳۶ء

پریم چند ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام دھنپت رائے اور قلمی نام پریم چند ہے۔ ان کے والد منشی عجائب لال پانڈے پور کے رہنے والے تھے اور ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ پریم چند کی زندگی کا آغاز بڑے حوصلہ شکن حالات سے ہوا۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے ظلم وستم کے باوجود انھوں نے فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی اور پھر بنارس کے ایک سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کر لی مگر ساتھ ساتھ حصولِ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان بھی پاس کر لیا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچ گئے۔ آپ کی شادی پندرہ برس کی عمر ہی میں ہوگئی تھی۔

۱۹۰۱ء سے ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا جو تا حیات جاری رہا۔ ۱۹۰۹ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے شائع ہوا جس پر حکومت نے پابندی لگا کر اس کی تمام کاپیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترکِ موالات کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ کافی عرصہ تک نول کشور پریس میں ایک ہندی رسالہ "مادھوری" کے معاون مدیر رہے۔ اس کے بعد ہفتہ وار پرچہ "جاگرن" نکالا جو زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور اسے بند کرنا پڑا۔ انھوں نے بنارس میں ذاتی پریس قائم کیا اور ایک ماہنامہ "ہنس" جاری کیا۔ یوں ان کی ساری زندگی مشکلات اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کی ناکام کوشش میں گزری۔ بالآخر صحت جواب دے گئی اور وہ ۱۹۳۶ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

پریم چند نے بہت سے افسانے اور ناول لکھے۔ ان کے اہم افسانوی مجموعے "سوزِ وطن"، "زادِ راہ"، "پریم پچیسی"، "پریم بتیسی"، "پریم چالیسی" اور ناول "میدانِ عمل"، "گئو دان"، "نرملا"، "بازارِ حسن" اور "بیوہ" ہیں۔

پریم چند نے اُردو ادب کو افسانہ نگاری سے متعارف کروایا۔ گویا فنِ افسانہ نگاری نے انھی کی وجہ سے عروج پایا۔ ان کے افسانوں میں انقلاب کی دستک سنائی دیتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" حکومت نے ضبط کر لیا۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کے کسانوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا کیونکہ یہی طبقہ تعداد میں زیادہ ہے اور اگر انھیں بیدار کر لیا جائے تو آزادی کی منزل قریب آ سکتی ہے۔ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مخالف تھے۔ اسی لیے وہ غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے حقائق کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں کیونکہ انھوں نے سنی سنائی باتوں کو پیش کرنے کی بجائے وہی لکھا جس کا براہِ راست مشاہدہ یا خود تجربہ کیا۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں سچائی اور خلوص کا جذبہ کارفرما ہے۔

پریم چند کی زبان سادہ ہے۔ اس میں ہندی وفارسی زبان کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات کے ذریعے تحریروں میں رنگینی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور مقامی واقعات وحقائق کو موضوع بنا کر تحریروں میں مقامی رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ ان کی تحریروں کی بنیاد معاشرتی مسائل، نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ پر ہے۔ ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہیں جن میں تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قریباً ہر عمر اور پیشے سے متعلق کردار پیش کیے ہیں۔

شاملِ کتاب افسانہ "زیور کا ڈبا" ان کا نہایت اہم افسانہ ہے۔ اس میں طبقاتی تضاد کو پیش کیا گیا ہے، جس میں ایک طبقے کے پاس بہت سرمایہ ہے، جو زندگی کی تمام نعمتیں فوراً حاصل کر سکتا ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو سسک سسک کر زندگی کی گاڑی کو دھکیلتا ہے اور بالآخر اس کی ایمانداری کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ بے ایمانی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پرکاش دوسرے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو انتہائی ایمان دار ہونے کے باوجود بے ایمانی پر مجبور ہو جاتا ہے مگر بیوی کے سمجھانے پر اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور وہ اپنی غلطی کی تلافی کرتا ہے..... چونکہ پریم چند کی اپنی زندگی بھی بڑی مشکلات کا شکار رہی اس لیے یہ تمام کشمکش اس کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھاتی ہے۔

زیور کا ڈِبّا

(۱)

بی۔اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا' وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی بھی جائیداد نہ چھوڑی' الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لا دیا۔ چندر پرکاش کو تیس روپے کی نوکری کرتے شرم تو آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ' ہوادار' صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا' لڑکا تو لگ بھگ انھی کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن' کام چور' ابھی نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا لڑکا ہی سمجھتے تھے۔ گویا وہ ملازم نہیں' گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملے میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا' پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا ''ابھی نہ جاؤ بیٹا' ذرا میرے ساتھ آؤ' تم سے کچھ کہنا ہے۔''

پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اوما دیوی نے کہا ''تمھاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں' ایک بہت اچھے گھر سے پیغام آیا ہے۔''

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا ''میں اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔''

''سب تیاریاں تمھیں کرنی پڑیں گی' یہ سمجھ لو۔''

''تو میں کب انکار کرتا ہوں۔''

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا۔ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھ میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیا خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار مینجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلے کا بنیا اسے گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپیا آسانی سے اڑا سکتا تھا لیکن وہ اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے' اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آ کر چمپا سے بولا۔ ''ہم تم یہاں روٹیوں کے محتاج' اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں کا زیور بنواڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی ''اونھ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے' وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔''

چندر پرکاش: ''یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا' باپ دادا چھوڑ گئے ہیں' مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔

چمپا: ''اپنا اپنا مقدر ہے۔ تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روزمرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے؟''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔

''یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔''

چمپا مسکرا کر بولی۔ ''چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گزر ہوتی جائے' یہی بہت ہے۔''

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکالیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ ''اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں' مجھے اس کی امید نہ تھی۔''

چمپا نے کہا ''کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔''

''ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔ ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ کہتے' اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے بھی لیتے جاؤ۔''

''تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے؟ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔''

''میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا' جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔''

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آئی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں، پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس کی چھت سے ملی ہوئی تھی' بیچ میں ایک فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا کہ پہلے زینے سے اتر کر کمرے میں چلوں؛ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا'' کیسا چرکا دیا۔'' کہہ دوں گا'' میری چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا، اس لیے میں اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے۔'' کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا:'' صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ ان کے سوا اور کون لے جاسکتا ہے؟' میں صاف نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد پھر دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔''

پھر بھی وہ جب زینے سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا'' بڑا غضب ہو گیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبا اٹھا کر لے گئے۔''

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا۔'' کسی نے پکڑا چور کو؟''

'' کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈِبا لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑا لی اور کیسے انھیں معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈِبا رکھا ہے۔''

'' نوکروں کی کارستانی ہوگی، باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔''

'' نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔''

'' نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔''

'' تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بیچاری رو رہی ہیں...... تمھارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور موئڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

پرکاش جھٹ پٹ اٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا۔'' یہ تو بڑا غضب ہوا ماتا جی! مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔''

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے'''' کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چور آیا کدھر سے؟''

ٹھکرائن نے رو کر کہا۔'' میں تو لٹ گئی بھیا! بیاہ سر پر ہے۔ کیا ہوگا؟

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا'' مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

ٹھکرائن نے مخالفت کی'' ارے نہیں بھیا! نوکروں میں ایسا کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یوں ہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔''

ٹھاکر صاحب نے ناک سکیڑ کر کہا'' تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے۔ جس نے اب تک چوری نہیں کی، چوری نہ کرے گا، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے

جوتے پڑیں گے تو آپ اقبالِ جرم کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں گے تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا "تم بھی بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔"

پرکاش: لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھی نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔"

ٹھکرائن: "نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو بھی مجھے یہی خیال رہے گا کہ کسی باہر کے آدمی کا کیا ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو پر چور آیا باہر سے۔ تمھارے کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے۔"

ٹھاکر: "ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو۔ شاید کچھ نشان ہوں۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟"

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا "میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں، کوئی پہلے ہی موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔"

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہ سکتے تھے۔

پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ "اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔"

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتا لگ جانے سے کیا؟ مال تو جانا تھا، وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپے کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔"

پرکاش: "میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

ٹھاکر: "کیوں اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔"

پرکاش: "آپ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ہے۔"

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا "بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا۔ یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔"

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے سے خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا "ایک سیٹھ کے ہاں ۵۰ روپے ماہوار کا کام مل گیا ہے مگر وہ روپے میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی۔"

خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پا کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا' وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک' صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا۔ اس کی چابی کہاں ہے؟ اس کا چمپا کو پتا نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں ''کچھ نہیں پرانی کتابیں ماری ماری پھرتی تھیں' اٹھا کر صندوق میں بند کر دی ہیں۔'' چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے لگی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ شبہے کا انکھوا سا نکلا' مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہوگئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا گرمی کے مارے دم گھٹتا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے؟

ایک دن چمپا نے کمرے میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا ''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔

بولی، ''میں کیوں ہٹانے لگی۔''

''پھر کس نے ہٹایا۔''

''گھر میں تم رہتی ہو۔''

''اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''کچھ نہیں یوں ہی پوچھا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں نہ دیکھ لیں' پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی' وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر بہلانے کے لیے بولا:

''طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا پکوڑیاں ہیں؟''

آج چمپا کے دل میں شبہے کا وہ انکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے' یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خریدی اور صندوق کھول ڈالا۔ ''ارے' یہ تو زیور ہیں۔'' معاً اس کے دل میں خیال گزرا' یہ زیور ٹھاکر صاحب کے تو نہیں؟'' چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے یک دم صندوق بند کر دیا اور

پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ''ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟''

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی' نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ تب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے تھے' مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے' آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکونٹٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟

پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: ''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا لیا۔ ''دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟''

''اجی درخواست تو دو' اگر سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کا فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ ''آپ نقد ضمانت داخل کر دیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے؟''

پرکاش گھر کی طرف چلا تو اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینے پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آ کر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ بعد بولی:

''ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ جگہ نہ ملتی نہ سہی' روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔''

''یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی' کیا میں ایسا اناڑی ہوں۔''

چمپا نے کہا۔ ''آدمی کی نیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔''

پرکاش سناٹے میں آ گیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے؟ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا ''تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟'' جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپانے آزردہ ہوکر کہا" کچھ نہیں، میں نے دنیا کی بات کی تھی۔"

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔اس نے پوچھا۔

" کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں اُن کی نیت بدلتی رہتی ہے؟"

چمپانے گلا چھڑانا چاہا" تم تو زبان پکڑتے ہو۔ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی ہی میں تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپے کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔"

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا، مسکرا کر بولا۔" اچھا تمھارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں نے کمیشن کے سوا ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔بڑے بڑے حُکّام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔"

چمپانے نفرت کے لہجے میں کہا" جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی لینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔تمہاری شرافت تو جب جانتی تم کمیشن کے روپے لے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ان چھ مہینوں میں انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔کچھ یاد ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ ۲۰ روپے ماہوار دیے جاتے ہیں۔علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے، تمھارے لیے ضرور بھیجتے ہیں۔تمھارے پاس گھڑی نہ تھی۔اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔تمھاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔تمھاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیے۔اسے تم چھوٹی سی بات سمجھتے ہو؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔"

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا، اکٹھا ہو کر نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے۔تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے، افسوس! چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔

(۷)

کئی روز گزر گئے۔پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویرا اندرا اور اس کی نئی دلھن بھی آئے ہوئے ہیں۔باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا" آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔"

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے، رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔تین عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔پرکاش جاگ رہا تھا۔ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا تھا۔پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔پھر کمرہ کھول کر صندوق میں سے زیورات کا ڈبا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔اس کے پاؤں تب بھی اسی

طرح تھرتھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا ڈر تھا' آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا' حرارت' اضطراب اور خلش سے پُر' اب بخار کا اتار تھا' سکون' فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا۔ آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویراندر کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبا رکھ دیا۔ پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ آیا۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی' گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبّے کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو دیرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش رات کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا' وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

دیراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ''بابو جی! کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی' جو زیور چوری ہو گئے تھے' سب مل گئے۔''

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے ''بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری' پورے کا پورا ڈبا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی' جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔''

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے' جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھے ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈِبّا کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا ''تعجب کی بات ہے میری عقل تو کام نہیں کرتی۔''

ٹھاکر: ''کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی! تمھاری ہی کیوں' ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا ہے۔''

ٹھاکر: ''آج اسی خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔''

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی' جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔''

''میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔''

''تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔''

''مجھے تو اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں خرچ کرنے سے بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔''

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

(زادِراہ)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- پرکاش کو ٹیوشن کیوں کرنی پڑی؟

ii- ویرو بابو کی شادی کے سلسلے میں پرکاش نے کیا مشورہ دیا؟

iii- پرکاش نے زیور کا ڈبا کس جذبے کے تحت چوری کیا؟

iv- زیور کے ڈبے کو اپنے گھر میں دیکھ کر چمپا کے کیا احساسات تھے؟

v- ''زیور کا ڈبا'' سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے؟

2- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں:

i- ''زیور کا ڈبا'' کا مصنف کون ہے؟

ا۔ غلام عباس	ب۔ ممتاز مفتی
ج۔ پریم چند	د۔ اشفاق احمد

ii- ''زیور کا ڈبا'' کا اہم ترین کردار کون ہے؟

ا۔ پرکاش	ب۔ چمپا
ج۔ ویراندر	د۔ ٹھاکر

iii- پرکاش نے زیور کا ڈبا کیوں واپس کیا؟

ا۔ بیوی کے کہنے پر	ب۔ ٹھاکر کے کہنے پر
ج۔ ویراندر کی خاطر	د۔ اپنے ضمیر کی آواز پر

3- مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر اُن کے آنسو پونچھ دیے۔

ii- جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

iii- شبے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔

iv- دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اُسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔

v- اپنا اپنا مقدر ہے ایشور کا کیا قصور!

4- ''زیور کا ڈبا'' میں ہندی کے کچھ ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر اردو میں استعمال نہیں ہوتے۔ مثلاً گہنے اور مونڈی کاٹا وغیرہ۔ آپ ایسے ہی چند اور الفاظ تلاش کر کے ان کے معنی لکھیں۔

5- مختصر افسانے کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کے اس افسانے کا اسی نقطہ نظر سے مختصر جائزہ لیں۔

6- ''زیور کا ڈبا'' میں پرکاش چمپا اور ٹھاکر صاحب کے کردار اہم ہیں۔ ان میں سے اپنے پسندیدہ کردار کا مختصراً جائزہ لیں۔

7- ''زیور کا ڈبا'' کا موضوع پرکاش اور چمپا کی مثالی محبت ہے یا زیور کا ڈبا؟ مختصراً جائزہ لیں۔

8- ''زیور کا ڈبا'' کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیں۔

غلام عباس

سالِ ولادت: ۱۹۰۹ء | سالِ وفات: ۱۹۸۲ء

غلام عباس امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لاہور میں تعلیمی سلسلہ مکمل کیا اور انٹر اور علومِ شرقیہ کے امتحانات پاس کیے۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۲۵ء سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''وطن'' ہے جو ٹالسٹائی کے افسانہ سے ماخوذ ہے۔ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء وہ غیر ملکی افسانوں کے ترجمے کرتے رہے۔ ان کا سب سے پہلا طبع زاد افسانہ ''مجسمہ'' تھا جو ''کارواں'' کے سالنامہ میں شائع ہوا۔

۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۷ء وہ امتیاز علی تاج کے بچوں کے رسالے ''پھول'' اور خواتین کے رسالے ''تہذیبِ نسواں'' کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور اس کے ہندی اور اُردو رسالوں ''آواز'' اور ''سارنگ'' کے مدیر بھی رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں نقد انعام سے نوازا۔ حکومت کی جانب سے انھیں ''ستارۂ امتیاز'' کا اعزاز بھی دیا گیا۔

غلام عباس کی اہم تصانیف میں ''گوندنی والا تکیہ'' (ناول)، ''دھنک'' (ناولٹ)، ''آنندی''، ''کن رس''، ''جاڑے کی چاندنی''، ''الحمرا کے افسانے'' اور ''جزیرہ سخن وراں'' (فرانسیسی افسانوں سے ماخوذ) شامل ہیں۔

اُردو افسانہ نگاری میں غلام عباس کا مقام اہم اور منفرد ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں ترقی پسندانہ رجحانات ملتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو یکجا کر کے نہ صرف اُردو افسانے کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اس میں اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر اسے ترقی کی راہ پر گامزن بھی کیا۔

غلام عباس اپنے کرداروں کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ وہ انھیں مثالی بنا کر ان کی شخصیت پر خیر و شر کی چھاپ لگانے کے قائل نہیں بلکہ جو کچھ ہمارے معاشرے میں ایک عام انسان کے ساتھ ہو گزرتا ہے وہ سب کچھ ان کے کرداروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں انتہا پسندی یا مثالیت کے بجائے فطرتِ انسانی کی عکاسی ملتی ہے۔ بقول ن۔ م۔ راشد ''غلام عباس ایک پُرامن اور پُرآہنگ گھریلو زندگی کے فن کار ہیں۔ ان کے فن میں زندگی کے رنگا رنگ مسائل کا احساس ملتا ہے۔''

غلام عباس موضوع کی تلاش بڑی باریک بینی سے کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تک کسی موضوع کو احاطۂ تحریر میں نہیں لاتے جب تک کہ وہ فکر اور جذبہ کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بن جائے۔ وہ اپنے وسیع مشاہدے کی بدولت اپنی تحریروں کو خوب نکھارتے ہیں۔

افسانہ ''کتبہ'' بھی ان کے وسیع مشاہدے اور باریک بینی کی مثال ہے۔ وہ ایک سنگ تراش کی دکان پر ایک سنگ مرمر کا ٹکڑا جس پر کسی ایک شخص کا نام کندہ ہے دیکھتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اسے دکان، مکان یا دفتر کے دروازے پر کہاں لگایا جائے۔ پھر وہ سوچتے ہیں کہ اگر ایک غریب شخص کے دن پھر جائیں اور وہ اپنا مکان بنائے تو وہ اس کتبے کو مکان کے دروازے پر لگائے گا۔ انھی تصورات کے نتیجے میں وہ یہ افسانہ لکھتے ہیں جس کے اختتام پر مکان نصیب نہ ہونے کے باعث یہ کتبہ اس کی قبر پر لگ جاتا ہے۔

غلام عباس کے انتقال کے ساتھ ہی اُردو افسانہ نگاری کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ بقول شوکت صدیقی ''غلام عباس کے ساتھ ہی اُردو افسانے کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ وہ عہد جو پریم چند سے شروع ہوا اور غلام عباس پر اختتام پذیر ہوا وہ اس بزم کے آخری چراغ تھے۔''

غلام عباس

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُرفضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بُخارات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انھی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی، اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ[1]، ریکارڈ کیپر[2]، ڈسپیچر[3]، اکاؤنٹنٹ[4]، ہیڈ کلرک[5]، سپرنٹنڈنٹ[6]، غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ[7] خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کی نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو

۱- Typist ۲- Record Keeper ۳- Despatcher ۴- Accountant ۵- Head Clerk
۶- Superintendent ۷- Type

تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گوان میں زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور گند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں، جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ گنے گنے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگا چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے' مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں' سنیاسیوں' تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا' سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گل دان' ٹیبل لیمپ' گھڑیاں' جلی ہوئی بیڑیاں' چوکھٹے' گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات' ستار' بھس بھرا ہرن' پیتل کے لم ڈھینگ' بدھ کا نیم قد مجسمہ......

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

''تین روپے!'' کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

''کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتایئے کیا دیجیے گا!''

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے

لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا' دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکان داروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

''ہم تو ایک روپیا دیں گے۔'' یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

''اجی سنیے تو کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیا بھی نہیں...... اچھا لے جایئے۔''

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے...... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعیٔ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے' دفتر سے آتے' کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر' یہاں تک کہ جب مہینا ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلّط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے' دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس

قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصّہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا' نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا' رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبے کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اُس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے' بے بال کے برش' بیکار صابن دانیاں' ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے' کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانا پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگا اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا' صابن سے دھویا' پونچھا

اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا' ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے......

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بے زار بے زار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا' نہ کسی سے بولتا چالتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیورا سے جلد ہی راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی' سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا' پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بد نما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی' لڑکوں کی تعلیم' اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش...... یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا' پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں سے اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(آنندی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- کلرکوں میں کس عمر کے لوگ شامل تھے؟

ii- شریف حسین اس دن گھر کے بجائے جامع مسجد کی طرف کیوں چل پڑا؟

iii- شریف حسین نے سنگ مرمر کے ٹکڑے کا کیا مصرف سوچا؟

iv- سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر شریف حسین نے کیا محسوس کیا؟

v- شریف حسین نے کتبہ کہاں رکھا؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواری ہی میں محدود رہتی ہے۔

ii- دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔

iii- وہ بڑا غفور الرحیم ہے کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔

iv- دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

v- ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے' کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

3- مندرجہ ذیل جملوں کی تکمیل کے لیے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب کے سامنے (✓) کا نشان لگائیں۔

i- شریف حسین کو سنگ مرمر کا ٹکڑا.........................

ا۔ وراثت میں ملا

ب۔ راستے میں پڑا ہوا ملا

ج۔ کسی دوست کی طرف سے تحفے میں ملا

د۔ کباڑی کی دکان سے ملا

ii- شریف حسین نے سنگ مرمر کا ٹکڑا اس لیے خریدا کہ.........................

ا۔ اس کی بیوی نے فرمائش کی تھی۔

ب۔ اس کی قیمت بہت کم تھی۔

ج۔ وہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر نصب کرانا چاہتا تھا۔

د۔ قیمت پوچھنے پر کباڑی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

iii- شریف حسین کے خیال میں سنگِ مرمر کا مصرف یہ تھا کہ.........................

ا۔ اسے افسر کو تحفے کے طور پر دے دیا جائے۔

ب۔ اسے کارنس پر سجا دیا جائے۔

ج۔ اس پر اپنا نام کھدوا کر مکان کے دروازے پر لگا دیا جائے۔

د۔ اسے مطالعے کی میز پر رکھ دیا جائے۔

iv- شریف حسین کی موت کے بعد سنگ مرمر کا ٹکڑا.........................

ا۔ یونہی گھر میں پڑا رہا

ب۔ کہیں گم ہو گیا۔

ج۔ بیچ دیا گیا

د۔ اس کی قبر پر لگا دیا گیا۔

4- ''کتبہ'' کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیں۔

5- غلام عباس پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- اس افسانے سے کیا اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے؟

7- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

مستقبل، معمول، اثاثہ، ادنیٰ و اعلیٰ، بے مصرف۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ (DRAU) سے مشتق ہے، جس کے معنی "کر کے دکھانا، حرکت یا عمل" ہے۔ ڈراما ایک ایسی افسانوی صنفِ ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی، کرداروں کے عمل اور حرکات سے سٹیج پر مکالموں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ ڈراما نویس کو کرداروں کی تخلیق کرتے ہوئے واقعات اور ان کی جزئیات کی وضع و ترتیب کے وقت، مکالمے لکھتے ہوئے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے غرض کہ ڈراما لکھنے کے دوران میں ہر ہر قدم پر اس امر کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ وہ قارئین کے لیے نہیں بلکہ ناظرین کے لیے لکھ رہا ہے۔ کہانی پڑھی نہیں جائے گی بلکہ اسے ایک خاص قسم کے سٹیج پر تماشائیوں کے لیے کھیلا جائے گا اور ڈراما اسی وقت کامیاب سمجھا جائے گا جب وہ سٹیج پر عمدگی سے کھیلا جا سکے۔

ڈرامے کے عناصر ترکیبی کا اہم جز پلاٹ ہے۔ ڈراما نگار کے پاس محدود وقت ہوتا ہے اور اسے اس محدود وقت میں پوری کہانی کرداروں کے عمل اور مکالموں کے ذریعے سے بیان کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے ڈراما نگار کا فرض ہے کہ وہ پلاٹ کی مختلف کڑیوں کو اچھی طرح مربوط کرے تاکہ کسی مقام پر بھی ڈرامے کی کہانی میں خلا کا احساس پیدا نہ ہو۔ ڈراما نگار کو کہانی کا انتخاب کرتے وقت سمجھداری کا ثبوت دینا چاہیے۔ کہانی کے واقعات میں جدّت اور ندرت ہونی چاہیے کیوں کہ غیر دلچسپ اور فرسودہ واقعات ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کرا سکیں گے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ڈراما نگار کا تخیل بلند ہو۔

کردار نگاری بھی ڈرامے کا ایک اہم جز ہے جس پر کہانی کا زیادہ تر انحصار ہوتا ہے۔ ڈرامے کے کردار جس قدر بھرپور ہوں گے اسی قدر وہ ڈرامے کی کہانی کے تاثر کو گہرا کرنے کا باعث بنیں گے۔ ناول اور افسانے میں ادیب کرداروں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کو الفاظ میں بیان کر سکتا ہے لیکن ڈرامے میں یہ کام کرداروں کو کرنا پڑتا ہے۔ انھیں اپنے دکھ، غم و خوشی کے تاثرات چہرے پر مختلف تاثرات ابھار کر ہاتھ پاؤں کی حرکات سے واضح کرنے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور اعلیٰ کردار نگاری ہی ڈراما نگاری کا کمال سمجھی جاتی ہے۔

ڈرامے کی تمام کہانی مکالموں کی صورت ہی میں ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ ڈراما نگار کا فرض ہے کہ وہ موقع و محل کے مطابق ہر کردار کی گفتگو اس کے مقام و مرتبے کو ملحوظ رکھ کر کرے۔ ہر کردار کی گفتگو میں حقیقت کا رنگ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ فطری انداز میں گفتگو کرے۔ روزمرّہ زندگی میں لوگ پُرشکوہ الفاظ اور مقفّیٰ و مسجع زبان میں گفتگو نہیں کرتے ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کو بھی اس سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح غیر ضروری اور طویل مکالموں سے بھی پرہیز ضروری ہے۔

موسیقی بھی ڈرامے کا ایک ضروری جز ہے۔ بعض اوقات پس پردہ موسیقی کا کوئی ٹکڑا مکالموں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ خاص طور پر ریڈیو اور ٹی وی کے ڈرامے تو موسیقی کے بغیر ممکن ہی نہیں کیوں کہ پس منظر کی موسیقی ڈرامے کے تاثر کو گہرا کرتی ہے۔

ڈراما نویس کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ناظرین میں نقادوں سے لے کر عوام و خواص ہر سطح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ڈرامے کی فنی نزاکتوں اور لطافتوں پر نظر رکھتے ہیں اور وہ بھی جن کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو ڈراما نگار اپنے ان دونوں طرح کے ناظرین کا خیال رکھتا ہے وہی کامیاب ڈراما نگار رہے۔

ڈرامے کی اہم ترین قسمیں المیہ اور طربیہ کہلاتی ہیں۔ المیہ ڈراما وہ ہے جس میں تصادم اور کشمکش کی بنیاد شان دار اور اعلیٰ انسانی عمل پر ہو مگر اس کا انجام اس کے اہم کرداروں کی شکست یا موت کی صورت میں ہو۔ طربیہ ڈراما وہ ہے جو زندگی کی ناہمواریوں اور کرداروں کی کوتاہیوں کو مزاح کے رنگ میں پیش کرے اور اس کا انجام خوشی کی صورت میں ہو۔ اوپیرا منظوم ڈرامے کو کہتے ہیں یا ایک ایکٹ کا وہ ڈراما ہے جس میں فن کے سارے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ایک واقعہ کو ایک ہی ایکٹ میں بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ایسے ڈرامے میں کردار اور مناظر کی کمی ہوتی ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی کی ایجاد کے بعد ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی ڈرامے لکھے جانے لگے۔ ریڈیو پر ڈرامے کی پیشکش نسبتاً مشکل عمل ہے کیونکہ اس پر مناظر دکھائی نہیں دیتے۔

اردو میں پہلا ڈراما "اندر سبھا" کے نام سے ۱۸۵۴ء میں سٹیج کیا گیا۔ بعد میں کئی تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہوئیں جن میں رونق بنارسی، میاں حسینی، طالب بنارسی اور احسن لکھنوی وغیرہ ڈراما نگار تھے لیکن آغا حشر ایسے ڈراما نگار ہیں جو نصف صدی تک تھیٹر پر چھائے رہے۔ انھوں نے بڑے خوب صورت ڈرامے لکھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں احمد شجاع پاشا کا "باپ کا گناہ" اور امتیاز علی تاج کا "انار کلی" بہت مشہور ہوئے۔ ریڈیو پر لکھنے والے ڈراما نگاروں میں اشتیاق حسین قریشی، عبدالمجید ملک، شاہد احمد دہلوی، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، باقی صدیقی، ابراہیم جلیس اور آغا بابر جیسے ادیب شامل ہیں۔ میرزا ادیب بھی ڈرامے کی دنیا کا ایک اہم نام ہے۔ ٹی وی کے ڈراما نگاروں میں بانو قدسیہ، اشفاق احمد، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، جمیل ملک، ڈاکٹر انور سجاد، حسینہ معین، یونس جاوید، فاطمہ ثریا بجیا، سلیم چشتی، عبدالقادر جونیجو اور منو بھائی قابلِ ذکر ہیں۔

امتیاز علی تاج

سالِ ولادت: ۱۹۰۰ء　　　　سالِ وفات: ۱۹۷۰ء

امتیاز علی تاج لاہور کے علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی ممتاز علی دیوبند سے نقل مکانی کر کے لاہور میں آباد ہوئے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم اور برصغیر میں جدید صحافت کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی والدہ محمدی بیگم بھی متعدد کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ گویا امتیاز علی تاج کو ماں اور باپ دونوں طرف سے علمی وادبی ماحول اور صحافیانہ مزاج ملا۔ بعد میں جس خاتون حجاب امتیاز علی تاج سے ان کی شادی ہوئی وہ بھی متعدد کتابوں کی مصنفہ تھیں۔

انھوں نے سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا اور تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کے بعد اپنا آبائی پیشہ صحافت اپنا لیا۔ وہ بہت سے رسالوں کے مدیر تھے جن میں بچوں کا رسالہ ''پھول'' خواتین کا رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' اور ''کہکشاں'' نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔

امتیاز علی تاج نے اپنی زندگی میں علم وادب کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ادب میں صحافت کے علاوہ انھوں نے ''فن ڈراما نگاری'' کی طرف توجہ دی۔ کالج کے زمانے ہی سے انھیں ڈرامے سے گہری دلچسپی تھی اور آخر دم تک وہ اسی کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔

امتیاز علی تاج نے بہت سے شاہکار ڈرامے لکھے۔ انھوں نے ایک ایکٹ کے اور ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے۔ ''چچا چھکن'' ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے کا نام ہے جو کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ انھوں نے مزاحیہ اردو ادب کے لیے چچا چھکن کا مشہور کردار تخلیق کیا۔ یہ ان کا شاہکار کردار ہے جو ہمارے معاشرے کے ایک خاص طبقے کا نمائندہ ہے جو خالص امتیاز علی تاج کی تخلیق ہے۔ یہ ''سرشار'' کے ''خوجی'' اور ''سجاد حسین'' کے ''حاجی بغلول'' کے بعد مشہور ترین مزاحیہ کردار ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو کے لیے بھی بہت سے ڈرامے لکھے۔ ان ریڈیائی ڈراموں میں ''قرطبہ کا قاضی''، ''آرام وسکون''، ''اصفہان کے شاعر''، ''ورجینا''، ''شیخ برادران'' اور ''کمرہ نمبر پانچ'' وغیرہ شامل ہیں۔

امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں تمام لسانی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلف ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور معمولی الفاظ کو بھی اتنی خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ قاری کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ اُن کے ڈراموں کی زبان سلیس اور رواں ہے۔

امتیاز علی تاج کرداروں کی تخلیق میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو نفسیاتی تجزیے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ محض کٹھ پتلی نہیں ہوتے بلکہ جاندار، زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔

امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں چستی، برجستگی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ کسی ڈرامے کی کامیابی کا دارومدار اس کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مکالمہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کے ہاں جذبات نگاری کی ایسی حسین مثالیں ملتی ہیں جو اردو کے ڈرامائی ادب میں بہت کم دستیاب ہیں۔

''قلعہ لاہور کا ایک ایوان'' تاج کے سب سے مشہور اور طویل ڈرامے ''انارکلی'' کا اقتباس ہے۔ اس میں مغلیہ خاندان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے نیم تاریخی المیہ کہا جاسکتا ہے۔ تاج نے اس میں رومانوی افسانویت کو مغل عظمت وجبروت کے پسِ منظر میں پیش کر کے اتنا حسین بنا دیا ہے کہ مغلیہ عہد کی تہذیب وثقافت کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ اس کا شمار اردو زبان کے بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔

قلعہ لاہور کا ایک ایوان

(قلعہ لاہور میں سفید پتھر سے بنا ہوا ایک بلند مگر نہایت سادہ اور دل کش ایوان جسے دیکھنے سے دماغ پر ایک فرحت افزا خاموشی اور خنکی کا سا اثر ہوتا ہے۔ اکبر ایک مسند پر آنکھیں بند کیے اور پیشانی پر ہاتھ الٹا رکھے چپ چاپ لیٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سخت ذہنی محنت کے بعد اس کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ اب بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے مضمحل اعصاب کو آرام پہنچانا چاہتا ہے۔ مہارانی پاس بیٹھی ہے۔ سامنے کنیزیں رقص کر رہی ہیں۔ مہارانی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہی ہے۔ اکبر ایک دو مرتبہ آنکھیں کھول کر یوں کنیزوں کی طرف دیکھتا ہے گویا ان کا رقص اسے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ آخر ہاتھ اٹھاتا ہے اور کنیزیں جہاں ہیں وہیں ساکت ہو جاتی ہیں۔)

مہارانی: (خاموشی سے چونک کر اکبر کو دیکھتی ہے) مہاراج؟

اکبر: (منہ موڑتے ہوئے، کنیزوں سے) جاؤ۔

(کنیزیں رخصت ہو جاتی ہیں)

مہارانی: کیوں مہابلی؟

اکبر: (آنکھیں بند کیے ہوئے) راحت نہیں۔ ان کے رقص کے قدم میرے تھکے ہوئے دماغ کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔

مہارانی: پھر اتنی محنت کیوں کیا کرتے ہیں مہاراج؟

اکبر: (آنکھیں کھول کر چپ چاپ پڑا کچھ دیر سامنے تکتا رہتا ہے۔ اور پھر سکون سے) شہنشاہ ہُوں رانی!

مہارانی: ....اور پھر بھی؟

اکبر: (پُر معنی انداز میں؟) کس کا قیاس جرأت کر سکتا ہے، کیا چاہتا ہوں۔

مہارانی: سیوک جو موجود ہیں۔

اکبر: (طنز کے خفیف تبسم سے) بیسوکوں نے کتنے بادشاہوں کو اکبرِ اعظم بنا دیا؟

مہارانی: [1] نورتن اتنے بے حقیقت ہیں؟

اکبر: (سکون سے) اگر ان کو اکبر کے خواب ہدایت نہ دیں۔

مہارانی: خواب!

اکبر: (خواب ناک نظروں سے سامنے کہیں دُور تکتے ہوئے) میری فوجیں، میری سیاست، میرے نورتن، سب میرے خوابوں کے پیچھے آوارہ ہیں۔ کون میری طرح ناممکن کے خواب دیکھ سکتا ہے؟ کون میری طرح اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ سکتا ہے............

مہارانی: آپ کی عظمت؟

اکبر: اور ابھی تک .... ہندوستان ایک مسکین کتے کی طرح میرے تلوے چاٹ رہا ہے۔ مگر ابھی تک میری زندگی کا سب سے میری عظمت میرے خواب ہیں رانی!

۱۔ شیخ مبارک، ابوالفضل، فیضی، عبدالرحیم خانِ خاناں، راجا مان سنگھ، راجا ٹوڈرل، حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام اور مرزا عبدالعزیز کوکلتاش

بڑا خواب ان دیکھا پڑا ہے اور میں اسے جنم دینے کا عزم اپنے میں نہیں پاتا۔

مہارانی: خواب کا جنم؟ کیا کہہ رہے ہیں مہابلی؟

اکبر: انسان کے جنم سے بہت زیادہ عزم چاہتا ہے رانی.......... اور میں بہت تھک گیا ہوں اور اکیلا ہوں .... شیخو .... کاش.......... شیخو

مہارانی: (اکبر کا منہ تکتے ہوئے) شیخو؟

اکبر: اپنے اجداد سے مختلف نہ ہو.......... تُو رانی.......... مغل..........

مہارانی: مغل کیا؟

اکبر: (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ (کسی قدر بے تاب ہوکر) مغلوں میں کوئی خواب دیکھنے والا نہ تھا۔ انھیں اکبر مل گیا۔ اگر اکبر کے جانشینوں میں تیمور کی طوفانی روح، بابر کی حیرت انگیز معلومات اور ہمایوں کا آہنی استقلال ہُوا (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے شیخو.......... کڑک کر، ہا! زمین سر بیخ تک کر رہ جائے اور قرن اور صدیاں اس کے سینے سے مغل علَم کو نہ اکھاڑ سکیں۔

مہارانی: (مناسب جواب کی کوشش میں) شیخو آپ کا موزوں جانشین ہوگا۔

اکبر: (گرم ہوکر) اگر اس کا یقین ہو جاتا۔ تو میں اپنے دماغ کا آخری ذرہ تک خواب میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن میری تمام امیدوں سے وہ اتنا بے اعتنا ہے، اتنا بے نیاز ہے کہ میں.......... لیکن میرا سب کچھ وہی ہے میں نہیں کہہ سکتا مجھے کتنا عزیز ہے۔ کاش وہ میرے خوابوں کو سمجھے۔ ان پر ایمان لے آئے۔ اسے معلوم ہو جائے، اس کے فکر مند باپ نے اس کی ذات سے کیا کیا ارمان وابستہ کر رکھے ہیں۔ وہ اپنی موت کے بعد اس میں زندہ رہنے کا کتنا مشتاق ہے.......... (سوچتے ہوئے) لیکن ابھی کیا معلوم!

مہارانی: ابھی بچہ ہی تو ہے۔

اکبر: (فہمائش آمیز متانت سے) ہماری محبت دیوانی نہیں کہ اس کا سن وسال بھول جائے اور ہم چاہتے ہیں تم بھی اسے یقین دلاؤ کہ فی الحال وہ ایک بے پروا نوجوان کے سوا اور کچھ نہیں۔

مہارانی: مگر وہ اپنے ہم عُمروں سے کچھ بہت مختلف تو نہیں ہے۔

اکبر: (کسی قدر برافروختہ ہوکر) یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو؟ اکبر سے؟ جو اس عمر میں ایک سلطنت کا بوجھ اپنے کم سن کندھوں پر اٹھا چکا تھا۔ جس نے دنیا کی بے باک نظروں کو جھکنا سکھا دیا تھا، جو اس عمر میں مفتوح ہند کو متحد کرنے کے دشوار مسائل میں منہمک تھا۔ ہاں جو اس عمر میں خواب تک دیکھتا تھا (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم ماں ہو۔ صرف ماں (جانا چاہتا ہوں)

مہارانی: آپ بہت تھک چکے ہیں۔ ابھی آرام فرمائیے۔

اکبر: کوئی رقص لاؤ۔ کوئی موسیقی۔ نرم، نازک، خوش آیند (بیٹھ جاتا ہے) انارکلی کہاں ہے؟ اُس کو بلاؤ، وہ تھکے ہوئے دماغ کو ٹھنڈک پہنچانا جانتی ہے۔

مہارانی: انارکلی بیمار ہے مہاراج اور اس کی ماں چاہتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو۔ تو اسے تھوڑے عرصے کو تبدیلِ آب وہوا کے لیے کسی دوسرے شہر بھیج دیا جائے۔

اکبر: (نیم دراز ہوتے ہوئے) حکیم نے اسے دیکھا؟

مہارانی: کچھ تشخیص نہ کرسکا لیکن خود انارکلی سمجھتی ہے آب وہوا کی تبدیلی اس کے لیے مفید ہوگی۔

اکبر: (بے پروائی سے) تم کو اعتراض نہیں تو اس کو اجازت ہے۔

مہارانی: لیکن حرم سرا کے جشن میں تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ اور انارکلی کے بنا جشن سُونا رہ جائے گا۔

اکبر: (کروٹ لیتے ہوئے) پھر مت جانے دو۔

مہارانی: دباؤ ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر: زبردستی کیوں ظاہر ہو۔ جشن تک اس کو علاج کے بہانے سے ٹھہرالیا جائے اور جشن میں شامل کرنے کے بعد رُخصت دے دی جائے۔

مہارانی: لیکن وہ جشن کا اہتمام کیسے کرسکے گی؟

اکبر: صرف رقص وسرود............انتظام کسی دوسرے کے سپرد ہو۔

مہارانی: دِلارام!

اکبر: ہاں کہاں ہے وُہ۔ اس کو بلاؤ۔ اس کا گیت میرے دماغ کو تازگی بخشے گا (رانی تالی بجاتی ہے)

(ایک خواجہ سرا حاضر ہوکر دست بستہ کھڑا ہوجاتا ہے)

مہارانی: دِلارام!

(خواجہ سرا رُخصت ہوجاتا ہے)

جشن کے متعلق کوئی ہدایت؟

اکبر: (کسی قدر چوکر) میرا نورتن کو ہدایت دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مہارانی: جشن میں شطرنج کھیلیں گے آپ؟

اکبر: کون کھیلے گا ہم سے؟

مہارانی: میں سلیم سے کہوں گی۔

(دِلارام حاضر ہوکر مجرا بجالاتی ہے)

مہارانی: دِلارام! حرم سرا کے جشن کا اہتمام انارکلی کے بجائے تُجھے کرنا ہوگا۔

دِلارام: بسروچشم!

مہارانی: اور انارکلی صرف رقص وسرود ہی کے لیے شریک ہوگی۔

دلارام: بہت بہتر۔

مہارانی: تو جانتی ہے جشن کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔

دلارام: حضور میں پہلے کئی جشنوں کا اہتمام کرچکی ہوں۔

مہارانی: اور دیکھ مہابلی سلیم سے شطرنج کھیلیں گے۔

دِلارام: (کسی قدر چونک کر) صاحب عالم سے!

مہارانی: ہاں!

دلارام کے دماغ میں سلیم اور انارکلی کے خیالات اس قدر گھومتے ہیں کہ وہ سن کر کھوئی سی جاتی ہے............

جشن شیش محل میں ہوگا..........اور روشنی..........تُو سن رہی ہے؟

دِلارام: (چونک کر) صاحبِ عالم؟

(اکبر آنکھ کھول کر دلارام کی طرف دیکھتا ہے)

دِلارام: صاحبِ عالم علیل تھے مہارانی۔

اکبر: نہیں وُہ شریک ہوگا۔

مہارانی: سنا، جشن شیش محل میں ہوگا۔ اور روشنی..........

اکبر: اب بس پہلے کوئی گیت۔ سیدھا سادا اور میٹھا۔ مگر آواز دھیمی اور نرم۔ گرم اور زخمی دماغ کو ایک ٹھنڈا مرہم چاہیے۔ رقص ہلکا پھلکا۔ گھنگروؤں کا شور نہ ہو۔ بہت چکر نہ ہوں۔ پاؤں آہستہ آہستہ زمین پر پڑیں جیسے پھُول برس رہے ہوں، برف کے گالے زمین پر اُتر رہے ہوں۔ لیکن خمار نہ ہو، نیند نہ آئے۔ ہمیں پھر مصروف ہونا ہے۔

(دلارام رقص شروع کرتی ہے۔ مگر رقص کے دوران میں بھی وہ سوچ میں ہے اور ذہنی مصروفیت کے باعث اُس کے رقص میں نقص نظر آ رہے ہیں)

اکبر: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کچھ نہیں کسی کو نہیں آتا۔ کوئی نہیں جانتا..........اور انارکلی علیل ہے۔

(اکبر اور پیچھے پیچھے مہارانی جاتی ہے)

دلارام: (جیسے سوچ میں سُن کھڑی رہ جاتی ہے) انارکلی ہوگی...... سلیم ہوگا۔ اور اکبر بھی...... کاش! اگر اکبر دیکھ سکتا...... کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی...... آہ! پر یہ ضرور ہوگا اور جشن ہی کے روز...... دو تارے...... وہی دو تارے...... مگر ایک دہکتا اور جگمگاتا ہوا......اور دوسرا ٹوٹ کر بُجھا ہُوا......اور کون جانے!

آہستہ سے زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سر جھکا کر ایک گہری سوچ میں کھو جاتی ہے۔

(انارکلی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

i- اکبر کو کنیزوں کا رقص تکلیف کیوں دے رہا تھا؟

ii- عظیم مغلیہ سلطنت کا خواب کس نے دیکھا؟

iii- اکبر شیخو کے بارے میں فکر مند کیوں تھا؟

iv- اکبر اپنے نورتنوں کو بے حقیقت کیوں سمجھتا تھا؟

v- حرم سرا کے جشن کا اہتمام انارکلی کے بجائے دلارام کے سپرد کیوں کیا گیا؟

2- درست بیان کے سامنے (✓) اور غلط بیان کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- ہماری کتاب میں شامل "انارکلی" مکمل ڈراما ہے۔

ii- ڈرامے کا زیادہ تر انحصار کردار نگاری پر ہوتا ہے۔

iii- اردو کا پہلا ڈراما "اندر سبھا" تھا۔

iv- مشہور کردار "خوجی" امتیاز علی تاج کی تخلیق ہے۔

v- امتیاز علی تاج کی شہرت کی وجہ ان کی افسانہ نگاری ہے

3- "انارکلی" کے شاملِ کتاب حصے کا خلاصہ لکھیں۔

4- امتیاز علی تاج پر مختصر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

5- "انارکلی" اردو ادب کا شاہکار ڈراما ہے ـــــ وضاحت کریں۔

6- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- ان کے رقص کے قدم میرے تھکے ہوئے دماغ کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔

ii- ابھی تک میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ان دیکھا پڑا ہے اور میں اسے جنم دینے کا عزم اپنے میں نہیں پاتا۔

iii- کاش وہ میرے خوابوں کو سمجھے، ان پر ایمان لے آئے، اسے معلوم ہو جائے اس کے فکر مند باپ نے اس کی ذات سے کیا کیا ارمان وابستہ کر رکھے ہیں۔

iv- ہماری محبت دیوانی نہیں کہ اس کا سن و سال بھول جائے۔

میرزا ادیب

سالِ ولادت: ۱۹۱۴ء

سالِ وفات: ۱۹۹۹

میرزا ادیب کا اصلی نام دلاور علی اور قلمی نام میرزا ادیب ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کا لگاؤ شعروادب سے تھا۔ یوں سکول کے زمانہ ہی سے ان میں ادبی رجحان فروغ پا رہا تھا۔

میرزا ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں بہت سی علمی و ادبی شخصیتیں موجود تھیں جنھوں نے میرزا کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ میرزا نے ابتدا میں شعروشاعری کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی اسے ترک کر کے افسانہ اور ڈراما نگاری کی طرف توجہ دی اور اس میں نام پیدا کیا۔

اس زمانے میں رومانوی تحریک عروج پر تھی۔ اس لیے میرزا ادیب نے بھی اسی تحریک کو اپنایا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت سنبھالی اور طویل عرصہ تک اس سے وابستہ رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران میں افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری کی طرف بھرپور توجہ دیتے رہے۔

میرزا ادیب یک بابی اور ریڈیائی ڈرامہ نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد اُردو ادب میں ایک ایکٹ کے ڈرامے کو جو فروغ ملا اس میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے نبض شناس تھے۔ اس لیے ان کے ڈراموں کے موضوعات عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں۔ اپنے معاشرے کی انسانی خواہشات اور توقعات کو میرزا ادیب نے خاص اہمیت دی ہے۔

میرزا ادیب نے کردار نگاری کے سلسلے میں بھی گہرے مشاہدے، انمول بصیرت اور فنکارانہ گرفت سے کام لیا ہے، اس لیے انھوں نے زندگی کے عام کرداروں کو ڈرامائی کرداروں کا درجہ دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت برجستہ، مختصر اور برمحل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں قاری یا ناظر کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے جو کسی کامیاب ڈراما نگار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے ڈراموں کے اہم مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ''آنسو اور ستارے''، ''لہو اور قالین''، ''ستون''، ''فصیلِ شب''، ''خاک نشیں''، ''پسِ پردہ'' اور ''شیشے کی دیوار''۔ ان کے علاوہ ''صحرانورد کے خطوط''، ''صحرانورد کے رومان'' اور ''مٹی کا دیا'' (آپ بیتی) ان کی زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔

میرزا ادیب

فاصلے

کردار

جمیلہ، ارشاد، منور بیگم، نعیم۔

(جمیلہ اور ارشاد مصروفِ گفتگو ہیں۔ جمیلہ ارشاد سے تین چار سال بڑی ہے)

جمیلہ: ارشاد! بھئی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کل آئی تھی تو تم بے حد خوش تھیں مگر آج اس قدر افسردہ ہو کہ طبیعت پریشان ہو گئی ہے۔ معاملہ کیا ہے آخر!

ارشاد: معاملہ کیا بتاؤں جمیلہ باجی!

جمیلہ: کیوں؟ بتاؤ گی نہیں۔ ایک تو وہ حال کہ فرخندہ کے جہیز کا ذکر کرتے ہوئے تھکتی ہی نہیں تھیں اور آج صورت یہ ہے کہ بچی کے بیاہ کی بات کرتی ہوں تو خاموش ہو جاتی ہو۔

ارشاد: پھر کروں کیا باجی!

جمیلہ: اُلجھن کیا ہے آخر!

ارشاد: اُلجھن سی اُلجھن ہے باجی!

جمیلہ: بتانے میں کیا حرج ہے؟

ارشاد: حرج کیا ہوگا باجی! منور نے جو حرکت کی ہے میں اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔

جمیلہ: منور بیگم؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟

ارشاد: سچ کہتی ہوں باجی! منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع شاید ایک دشمن سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے یہ سوچ کر اس کے بیٹے سے اپنی فرخندہ کی منگنی کی تھی کہ میری بچپن کی سہیلی ہے میرا پورا ساتھ دے گی لیکن ہُوا اس کے بالکل برعکس ہے۔

جمیلہ: کیا نعیم نے کچھ گڑبڑ کی ہے؟

ارشاد: نعیم کیا گڑبڑ کرے گا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔

جمیلہ: اس کے ابا جان کو اس رشتے پر کچھ اعتراض ہے؟

ارشاد: بالکل نہیں؟

جمیلہ: تو پھر میں نہیں سمجھتی کہ تمھیں شکایت کس سے ہو سکتی ہے؟

ارشاد: باجی! میں نے کہا نہیں ہے کہ منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع کسی دشمن سے بھی نہیں ہو سکتی تھی؟

جمیلہ: ذرا تحمّل سے بات کرو۔ میرا تو خیال ہے کہ فرخندہ کو وہ بہت پسند کرتی ہے۔ کئی بار میں نے اسے تمھاری بچی کو پیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ارشاد: پیار ہوتا تو ہم پر ظلم نہ کرتی۔

جمیلہ: کیا انکار کر دیا ہے؟

ارشاد: جو کچھ کہا ہے وہ انکار سے بھی بدتر ہے۔

جمیلہ: انکار سے بھی بدتر!

ارشاد: ہاں باجی! یاد ہے باجی! اس رشتے پر گفتگو سب سے پہلے تم ہی نے کی تھی۔

جمیلہ: یقیناً میں نے کی تھی اور منور نے ایسی خوشی کا اظہار کیا تھا جیسے وہ ایک مدت سے ہی اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔

ارشاد: کہ مجھے ذلیل کرے۔ اس کے پیش نظر اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ باجی! تم جانتی ہو کہ ہم دونوں میں یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ آنے والے دسمبر کے آخری دنوں میں شادی ہو گی۔ جہیز قریب قریب مکمل کر لیا ہے۔ سب کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔ اب محترمہ نے بیٹھے بیٹھے یہ مطالبہ کر دیا ہے کہ فرخندہ کے جہیز میں ایک کوٹھی بھی شامل ہو۔

جمیلہ: کیا؟

ارشاد: لو پڑھو۔ کل شام کے وقت یہ رقعہ ملا تھا۔

جمیلہ: (پڑھتے ہوئے) پیاری بہن جمیلہ خاتون! میری یہ خواہش نہیں شدید مطالبہ بھی ہے کہ فرخندہ کے جہیز میں ایک کوٹھی بھی شامل کرو۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس کے بغیر جو جہیز بنے گا وہ ہمیں منظور نہیں ہو گا۔

ارشاد: دیکھا باجی! اس قسم کا مطالبہ اور پھر اس صورت میں سوائے دشمن کے اور کون کر سکتا ہے۔

جمیلہ: میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص ہوش و خرد کے عالم میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ منور نے رقعہ لکھا ہے؟

ارشاد: اور کس نے لکھا ہے! تمھیں شک ہے!

جمیلہ: دکھاؤ نا کاغذ۔ نیچے نام کیا لکھا ہے............ یہ منور کہاں ہے۔ کوئی اور نام ہے۔

ارشاد: ''منجو'' ہے۔

جمیلہ: ''منجو''............ یہ کون ہے؟

ارشاد: ہم لوگ اسے منور نہیں منجو کہا کرتے تھے۔

جمیلہ: گویا رقعہ اس نے لکھا ہے۔

ارشاد: اور کس نے لکھا ہے باجی! ایسے لفظ لکھتے ہوئے اُسے کچھ شرم بھی نہیں آئی۔ لے دے کے دو کوٹھیاں ہیں ہمارے پاس۔ ایک میں رہتے ہیں اور دوسری سے جو کرایہ ملتا ہے اس سے گزر اوقات کرتے ہیں۔ فرخندہ کے ابا کی جتنی تنخواہ ہے وہ تم جانتی ہو۔ اس تنخواہ سے گھر کے اخراجات کس طرح پورے ہو سکتے ہیں اور پھر یہ بھی دیکھو، میں صرف فرخندہ کی ماں نہیں ہوں گھر میں بیاہنے لائق دو اور بھی بیٹیاں ہیں۔ اس بیٹی کے جہیز میں کوٹھی دے دیں تو باقی دو بیٹیوں کو کیا دیں گے۔ یہ اپنے بیٹے کے لیے کوٹھی کا مطالبہ کر رہی ہے تو وہ ماں باپ کوٹھیاں کیوں نہیں مانگیں، جن کے گھروں میں ہماری دوسری دو بیٹیاں جانے والی ہیں۔

جمیلہ: ٹھیک کہہ رہی ہو!

ارشاد: ابھی میں نے فرخندہ کے ابا سے اس رقعے کا ذکر کیا نہیں، کیا کہوں اُن سے! کیا کہیں گے وہ۔ یہ تمھاری پُرانی سہیلی ہے۔ بڑا ناز کرتی تھیں اس پر۔ بہت خوش ہو رہی تھیں یہ رشتہ کر کے۔ اب بتاؤ کیا کہتی ہو تم، باجی! وہ کیا کچھ نہیں کہیں گے؟ کیا کچھ نہیں سوچیں گے؟ اگر ایسا مطالبہ کرنا تھا تو شروع ہی میں انکار کر دیتی۔ مجھے زیادہ شکایت نہ ہوتی بلکہ کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن اس وقت کہ سب عزیزوں، رشتہ داروں کو علم ہو چکا ہے کہ میری فرخندہ منور کے گھر جا رہی ہے۔ چند ماہ بعد شادی ہو رہی ہے اس کا یہ مطالبہ کسی طرح

بھی جائز ہے؟

جمیلہ: بالکل ناجائز ہے!

ارشاد: (آواز میں جذبات کی شدت سے لرزش) میں کیا مُنہ دکھاؤں گی لوگوں کو۔ رشتے دار کیسے کیسے طعنے دیں گے۔ میری بچی کے دل پر کیا گزرے گی۔ باجی! یہ کس کارن ہمارے درپے آزار ہوگئی ہے۔

جمیلہ: صریحاً زیادتی کر رہی ہے۔

ارشاد: زیادتی سی زیادتی باجی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوگا کیا!

جمیلہ: ارشاد۔

ارشاد: کہو باجی۔

جمیلہ: اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ارشاد: کیا ابھی کوئی امید کی صورت باقی ہے؟

جمیلہ: کیوں نہیں؟ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔ اسے بتاؤں گی۔ امید ہے معقولیت کی راہ اختیار کرے گی۔

ارشاد: اگر نہ کی تو............

جمیلہ: کیوں نہ کرے گی...... مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ مطالبہ کسی غلط فہمی کی بنا پر کیا ہے۔

ارشاد: غلط فہمی کیسی؟

جمیلہ: میرا مطلب ہے۔ کسی لگائی بجھائی کرنے والی عورت کے بھرّے میں آکر۔ جانتی ہو دنیا میں ایک دوست اور دس دشمن ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تم نے اس رقعے کا کوئی جواب تو نہیں دیا۔

ارشاد: جواب کیا دے سکتی تھی۔

جمیلہ: بس ٹھیک ہے۔ گفتگو کرتی ہوں ابھی جا کر۔ جب تک لوٹوں کسی سے کچھ کہنا سننا نہیں ہے اور نہ افسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ پتا نہیں کیا صورتِ حال ہے اور کیوں ہے؟ سمجھ لیا نا۔

ارشاد: ہاں۔

جمیلہ: ذرا کریم سے کہنا ٹیکسی لے آئے۔

(منظر کی تبدیلی کے لیے موسیقی)

جمیلہ: منور! جب میں نے وہ رقعہ پڑھا تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے لکھنے والی تم ہو۔ یہ تمھیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے منور! حد کر دی ہے۔ سراسر زیادتی کر رہی ہو۔

منور: نہیں آپا۔

جمیلہ: زیادتی نہیں کر رہی تو اور کیا کر رہی ہو۔

منور: یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کر رہی ہوں مگر زیادتی نہیں کر رہی۔

جمیلہ: کمال کر رہی ہو۔ اتنی زیادتی کے بعد بھی کہہ رہی ہو کہ زیادتی نہیں کر رہی۔ تمھیں خبر نہیں ہے کہ ایک کوٹھی کے کرائے سے اُن کے گھر کا خرچ چلتا ہے۔

منور: ماں باپ اولاد کی خوشی کے لیے قربانی نہیں دیتے!

جمیلہ: اچھا فرض کرلیا جائے کہ وہ اپنی بیٹی کو کوٹھی دے دیں تو باقی دو بیٹیوں کو کیا ملے گا؟

منور: میرا اس مسئلے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ اس کی اور اس کے شوہر کی دردسری ہے میری نہیں۔

جمیلہ: اور تم یہ چاہتی ہو کہ تمھارے بیٹے کو ضرور کوٹھی دے دی جائے۔

منور: کوٹھی اس کی بیٹی کی ہوگی میری نہیں۔

جمیلہ: منور معاف کرنا شاید یہ الفاظ تمھیں تلخ لگیں گے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تمھاری اپنی کوئی بیٹی نہیں ہے اس لیے اس طرح سوچ رہی ہو۔ تمھارے گھر میں بھی بیٹی ہوتی پھر میں دیکھتی کہ کس طرح اپنے بیٹے کے لیے یہ مطالبہ کرتیں۔ بیٹی نہیں ہوئی۔ اس لیے ان فکروں اور اندیشوں سے آزاد ہو جن میں بیٹیوں والے رات دن گرفتار رہتے ہیں۔ بیٹی کا بوجھ سر پر ہو تو ماں بہت آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہے کیوں کہ اس کے راستے میں کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ اگر تمھارا اپنا راستہ ہموار ہے تو اس ماں کا بھی خیال کرو جس کے سامنے چاروں طرف بلند پہاڑ کھڑے ہیں۔ اس کا کیا حال ہے۔ اُس کا کیا حال ہونے والا ہے۔ یہ بھی سوچ لو۔

منور: مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جمیلہ: اتنی کٹھور ہو چکی ہو۔

منور: جو دل میں آئے کہہ دو۔ میں بُرا نہیں مانتی۔

جمیلہ: منور!

منور: آپا! اس وقت تم کہہ رہی ہو کہ میں زیادتی کر رہی ہوں۔

جمیلہ: بالکل زیادتی کر رہی ہو۔

منور: اور یہ اس لیے کہ کبھی مجھ پر بھی زیادتی ہوئی تھی۔

جمیلہ: کیا؟

منور: ایک منٹ ٹھہرو آپا! (ذرا سا وقفہ) یہ پڑھو۔ آہستہ سے ہاتھ میں لو۔ پُرانا کاغذ ہے۔

جمیلہ: یہ کیا ہے۔ (پڑھتے ہوئے) "ماں باپ اولاد کی خوشی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ آپ اپنی بیٹی کو ایک کار دے دیں گے تو کیا قیامت آجائے گی۔" یہ ہے کیا؟

منور: یہ رقعہ ارشاد کی ماں نے میری مرحوم ماں کے نام لکھا تھا۔

جمیلہ: کیوں؟

منور: میری منگنی ارشاد کے بھائی سے ہو چکی تھی۔ بیاہ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں کہ یہ رقعہ آ گیا۔

جمیلہ: اس میں ارشاد کا کیا قصور؟

منور: یہ رقعہ ارشاد ہی نے انتہائی اصرار کر کے اپنی ماں سے لکھوایا تھا کیوں کہ ان دنوں ایک دولت مند لڑکی اس کی نئی سہیلی بنی تھی اور اس دولت مند سہیلی کی چھوٹی بہن کنواری تھی۔ ارشاد چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کی شادی وہیں ہو۔

جمیلہ: ہیں!

منور: آپا! جب یہ رقعہ ابا اور امی نے پڑھا تو ان کی جو حالت ہوئی بیان نہیں کر سکتی۔ اب بھی ان کے انتہائی افسردہ، پژمردہ، دُکھی، غم دیدہ

چہرے یوں آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو میں کانپ اُٹھتی ہوں۔ان دنوں ہمارے گھر کی حالت بہت خراب تھی۔بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔پندرہ بیس ہزار کی کار کہاں سے آتی۔اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ رشتہ ٹوٹ گیا اور یہی بات تو ارشاد چاہتی تھی۔آپا تم کہتی ہو میں ارشاد پر زیادتی کر رہی ہوں۔سوچو اس وقت اسے خیال نہ آیا ''منجو'' جس پر ظلم کر رہی ہے اس کی بچپن کی سہیلی ہے۔اس کے ساتھ سکول میں پڑھ چکی ہے۔جس کے دُکھ کو وہ اپنا دُکھ درد جس کی خوشی کو وہ اپنی خوشی سمجھتی رہی ہے۔اسے خیال نہ آیا کہ بیچاری منجو کا کیا حال ہوگا۔اس کے غریب ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔اس نے یہ نہ سوچا کہ زندگی کا راستہ ہمیشہ ہموار نہیں رہتا۔اس میں اچانک بڑے گہرے کھڈ آجاتے ہیں۔اس راہ پر پھول ہی نہیں اُگتے۔کانٹے بھی نکل آتے ہیں۔آپا! میں کچھ نہیں کر رہی۔جو کچھ کر رہی ہے منجو کر رہی ہے۔وہ منجو جسے آج سے تیرہ چودہ برس پہلے اُس نے ٹھکرا دیا تھا۔جو رات رات بھر روتی رہی تھی۔جس نے اپنی بدنصیب ماں کو اپنے فکرمند باپ کو آہیں بھرتے دیکھا تھا۔وہ منجو میرا تعاقب کرتی رہی ہے۔اور اسی نے مجھے ایک طرف ہٹا کر یہ رقعہ لکھا ہے۔

(منور درد جذبات میں دو تین لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی ہے)

جمیلہ: منور بہن! مجھے اس واقعے کا کوئی علم نہیں تھا۔

منور: وہ کیوں بتاتی تمھیں!

جمیلہ: حیرت ہے اپنی بیٹی کی منگنی تمھارے بیٹے سے کرتے ہوئے وہ بھول گئی کہ وہ تم پر یہ ظلم کر چکی ہے۔

منور: میں یہ بھی بھول جانا چاہتی تھی اور بھُول گئی تھی۔اللہ نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ایک نیک طینت شوہر جو میری ہر بات مان لیتا ہے۔ایک اطاعت شعار بیٹا جسے دیکھتی ہوں تو اپنی آغوشِ تربیت پر فخر ہوتا ہے لیکن جب تنہا ہوتی ہوں تو ''منجو'' نہ جانے کہاں سے نکل کر چپ چاپ سامنے آجاتی ہے۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔سر جھکا ہوا ہے۔سر سے پاؤں تک وہ مجھے مظلومیت کی تصویر نظر آتی ہے............اور............

جمیلہ: اسے معلوم ہونا چاہیے:۔مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا منور............اور کچھ نہیں کہنا۔

(ذرا سا وقفہ)

منور: (ذرا بلند آواز سے) نعیم بیٹا!

نعیم: جی امی جان!

منور: کیا ابھی ابھی باہر سے آ رہے ہو۔

نعیم: جی ہاں، فرمائیے۔

منور: نعیم بیٹا! میں آج کچھ کہنا چاہتی ہوں تم سے۔

نعیم: امی! آپ یہ الفاظ کہ کر مجھے شرمسار کر رہی ہیں۔آپ مجھے حکم دیں آپ کے کسی حکم پر میں چون وچرا نہیں کر سکتا۔

منور: مجھے اپنے اطاعت شعار بیٹے سے یہی توقع ہے۔بیٹا! قصہ یہ ہے کہ تمھاری منگنی ٹوٹ گئی ہے۔

نعیم: ٹوٹ گئی ہے۔

منور: میں نے توڑ دی ہے۔

نعیم: اچھا امی جان۔

منور: نہیں............کچھ............میرا مطلب ہے............

نعیم: امی جان! آپ جو کچھ کریں گی اس پر میں کبھی اعتراض کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف ایک دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔

منور: کہو!

نعیم: یہ رشتہ اس لیے ختم کر دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو آپ میری سسرال بنانا چاہتی تھیں وہ کوٹھی کا مطالبہ پورا نہ کر سکے۔

منور: ہاں

نعیم: اور یہ بھی کہ آپ نے ان سے کوٹھی کا مطالبہ اس لیے کیا ہے کہ انھوں نے میرے نانا نانی سے کار کا مطالبہ کیا تھا۔

منور: یہ باتیں تمھیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟

نعیم: امی! میں ابھی ابھی خالہ جان کے گھر سے آیا ہوں۔ اُنھوں نے ذکر کیا تھا مگر مجھے ان سے کیا امی! میرا فرض تو آپ کا حکم ماننا ہی ہے۔ میں آپ کے ہر حکم کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتا ہوں۔

منور: اللہ کرے تمھیں زندگی کی ساری خوشیاں حاصل رہیں۔ ہمیشہ سکھی رہو۔ جا رہے ہو نعیم! جاؤ۔

(ذرا سا وقفہ)

منور: کیوں نعیم! لوٹ آئے کیا بات ہے؟

نعیم: امی! آئندہ آپ میرے رشتے کی بات چیت کبھی نہ کریں۔

منور: وہ کیوں؟

نعیم: میں شادی نہیں کراؤں گا۔

منور: شادی نہیں کراؤ گے؟

نعیم: جی امی جان! اس کی وجہ یہ ہے! میں ایک لڑکی کو کسی گناہ، جُرم اور قصور کے بغیر سزا دینے کے بعد مناسب نہیں سمجھتا کہ کسی اور گھر کے دروازے پر دستک دی جائے۔ اگر بے گناہوں کو ذاتی انتقام کی آگ میں جھونک دینے کا سلسلہ چل نکلا تو ہر طرف شعلے ہی شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ کرے کوئی اور بھرے کوئی کی روایت نہ جانے کتنے گھروں کا سکون لوٹ لے گی۔ کتنے گھر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ امی جان! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ شاید گستاخی ہے لیکن آپ نے ہی تو مجھے سبق دیا ہے کہ بیٹا! ہمیشہ سچ بولو میں آپ کی نصیحت پر عمل کر رہا ہوں۔ اچھا امی جان!

(وقفہ)

ارشاد: کون ہے؟

منور: دروازہ کھولو۔

ارشاد: منور!............تم۔ میرے گھر پر!

منور: ہاں تمھارے گھر پر۔

ارشاد: باجی جمیلہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے...... اور میں سمجھ چکی تھی کہ اب ہم دونوں گھروں میں ہزاروں لاکھوں میلوں کی دُوری آچکی ہے۔

منور: یہ دُوری منجو نے پیدا کی تھی۔

ارشاد: تو اب۔

منور: وہ اپنی ساری دُوریاں، سارے فاصلے، ساری کدورتیں لے کر چلی گئی ہے۔ اب نہیں آئے گی۔

ارشاد: مگر مجھے کچھ دے گئی ہے۔

منور: کیا؟

ارشاد: ندامت کے آنسو جو میری آنکھوں سے بہ رہے ہیں۔

منور: ارشاد بہن! ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔

ارشاد: نہیں تم یہ افسوس قبول کرو۔

منور: میں کیا قبول کروں۔ میری تو اپنی آنکھوں میں شرمندگی کے آنسو چھلک رہے ہیں۔

ارشاد: اچھا ہوا یہ آنسو بہ گئے۔ ان کے ساتھ نفرت، انتقام، خودغرضی کی کثافت بھی بہ گئی ہے۔

منور: ارشاد بہن!

ارشاد: منور بہن!

(اختتام)

("تحریریں" لاہور ____ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- ارشاد پریشان کیوں تھی؟

ii- منور نے کیا کیا تھا جس کی توقع دشمن سے بھی نہیں ہو سکتی؟

iii- منور نے رقعے میں کیا لکھا تھا؟

iv- منور اپنی زیادتی کو زیادتی کیوں نہیں سمجھ رہی تھی؟

v- جمیلہ کو کس واقعہ کا علم نہیں تھا؟

2- درست جوابات کے گرد دائرہ لگائیں:

i- "فاصلے" کا مصنف کون ہے؟

ا۔ امتیاز علی تاج ب۔ میرزا ادیب ج۔ آغا حشر د۔ حکیم احمد شجاع

ii- میرزا ادیب کی وجہِ شہرت زیادہ تر کیا ہے؟

ا۔ مضمون نگاری ب۔ افسانہ نگاری ج۔ تنقید نگاری د۔ ڈراما نگاری

iii- میرزا ادیب کا تعلق کس شہر سے تھا؟

ا۔ سیالکوٹ سے ب۔ لاہور سے ج۔ گوجرانوالا سے د۔ راولپنڈی سے

3- ڈراما ''فاصلے'' کا مرکزی خیال لکھیں۔
4- ڈراما ''فاصلے'' کا خلاصہ لکھیں۔
5- میرزا ادیب پر مختصر سوانحی وتنقیدی نوٹ لکھیں۔
6- ''میرزا ادیب اپنے ڈراموں میں عام زندگی کے کرداروں کی باہمی کشمکش کو موضوع بناتے ہیں''۔ ڈراما ''فاصلے'' کے ایک اہم کردار پر مختصر نوٹ لکھیں۔
7- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:
i- منور نے جو کچھ کیا ہے اس کی توقع شاید ایک دشمن سے بھی نہیں کی جا سکتی۔
ii- میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص ہوش وخرد کے عالم میں یہ نہیں کر سکتا۔
iii- اگر تمھارا اپنا راستہ ہموار ہے تو اس ماں کا بھی خیال کرو جس کے سامنے چاروں طرف بلند پہاڑ کھڑے ہیں۔
iv- کرے کوئی اور بھرے کوئی کی روایت نہ جانے کتنے گھروں کا سکون لوٹ لے گی۔
v- اچھا ہوا یہ آنسو بہ گئے، ان کے ساتھ نفرت، انتقام، خود غرضی کی کثافت بھی بہ گئی ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

مضمون

مضمون نثر کی وہ صنف ہے جس میں کسی خاص موضوع پر اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کو مبسوط ومربوط انداز میں قلم بند کیا گیا ہو۔ مضمون نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس موضوع پر مضمون لکھ رہا ہے سب سے پہلے اس کے بارے میں ضروری علمی مواد جمع کرے پھر اس مواد کو مختلف پیراگراف میں تقسیم کر کے پیش کرے۔ پہلے اپنے موضوع کا تعارف کرائے پھر ان دلائل و براہین کو پیش کرے جو اس کے موضوع کی حمایت یا مخالفت میں ہوں اور آخر میں کوئی نتیجہ برآمد کرے۔

مضمون جس نوعیت کا ہو، زبان بھی ویسی ہی لکھنی چاہیے۔ اگر مضمون سائنسی، تاریخی یا مذہبی نوعیت کا ہو تو ان علوم وفنون کی مروجہ اصطلاحات وتراکیب کا استعمال ہونا چاہیے۔ اسی طرح تاثراتی یا بیانیہ نوعیت کے مضامین یا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی زبان آسان اور سادہ ہونی چاہیے تاکہ ہر ذہن کا قاری ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ شاعرانہ زبان صرف تاثراتی قسم کے مضامین کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

مضمون میں خیالات کا مرتب و منظم ہونا ضروری ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اُسے ترتیب و تنظیم سے پیش کرے۔ اگر خیالات منتشر یا منطقی ربط سے محروم ہوں گے تو مضمون مطلوبہ اثرات پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔

مضمون اور مقالے میں معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ مضمون مختصر ہوتا ہے جبکہ مقالہ طویل ہوتا ہے۔ مضمون میں موضوع کے اعتبار سے سادہ زبان بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور بیان میں شگفتگی بھی ہوتی ہے جبکہ مقالے میں سنجیدگی اور علمی وقار ہوتا ہے۔ مقالے میں مقالہ نگار اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا انداز تحقیقی اور عالمانہ ہوتا ہے۔ مضمون سطحی معلومات بہم پہنچاتا ہے جبکہ مقالے کے مضامین میں زیادہ گہرائی ہوتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز سرسید احمد خاں نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' سے کیا۔ اس رسالے نے سرسید کے علاوہ شبلی، نذیر احمد، مولوی چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مضمون نگار پیدا کیے۔ ان کے بعد کے مضمون نگاروں میں مولوی عبدالحق، فرحت اللّٰہ بیگ، سر عبدالقادر، عبدالحلیم شرر اور حافظ محمود شیرانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جدید دور کے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللّٰہ، سید وقار عظیم، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سرسید احمد خاں

سالِ ولادت: ۱۸۱۷ء　　سالِ وفات: ۱۸۹۸ء

سرسید احمد خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد شاہجہان کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے اور شاہی دربار میں ملازم ہوئے۔ سرسید کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ سرسید کے والد نہایت قناعت پسند انسان تھے اور والدہ بے حد ذہین اور نیک خاتون تھیں۔ زمانے کے دستور کے مطابق سرسید نے قرآن مجید، عربی، فارسی اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ نیز ریاضی، ہیئت، منطق، صرف و نحو اور علم بیان میں بھی کمال حاصل کیا۔ ذوق شعر و سخن سرسید کو ورثہ میں ملا تھا۔ غالب اور مومن کی صحبتوں نے ان کے ذوق و شوق کو مزید جلا بخشی۔

وہ ۱۸۳۸ء میں دہلی میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے سب جج کے عہدے پر پہنچ گئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے سرسید کو جوادالدولہ کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۵۵ء میں صدر امین ہوکر بجنور میں مقیم ہوگئے۔ دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو وہ اپنی والدہ کے ہمراہ میرٹھ روانہ ہوگئے۔ انھی ایام میں انسانی ہمدردی کے تحت انھوں نے کئی انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید کے صاحبزادے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان روانہ ہوئے تو سرسید بھی اپنے بیٹے کے ہمراہ چلے گئے تاکہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کرسکیں۔ چنانچہ جب ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر کالج کے قیام کا ارادہ کیا اور علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا جو بتدریج ترقی کرتے ہوئے کالج اور پھر یونیورسٹی بن گیا۔

سرسیّد نے اپنی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری اور اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے مسلمان قوم کو زیورِ تعلیم اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے ایک نئی راہ دکھائی۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے ستر برس کی عمر میں پنشن لی اور تمام تر مشکلات کے باوجود آخری دم تک اپنا مشن جاری رکھا۔

سرسید کی اہم تصانیف یہ ہیں:۔

آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، خطبات احمدیہ، تصحیح آئینِ اکبری، تاریخ سرکشی بجنور، سفرنامۂ انگلستان، کلمۃ الحق، مضامینِ تہذیب الاخلاق، اور قرآن مجید کی تفسیر۔

رسم ورواج

جو لوگ کہ حسنِ معاشرت اور تہذیب اخلاق وشائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں اُن کے لیے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم ورواج کو اچھا اور کسی کو برا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم ورواج کو پسند کرتی ہے اور اُسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی چھٹپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا' عادت پڑ گئی' وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہوا اور عادت نہ پڑی وہی بری ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں' بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔ رسم ورواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اُس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا، عیب نہیں لگاتا کیونکہ سب کے سب اُس کو کرتے ہیں مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہٖ بری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ بس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسا کر لینا نہ چاہیے بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اُس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو جو حقیقت میں بد ہو اور بہ سبب رسم ورواج کے ہم کو اُس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اُس کے رواج وعدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے تو اس طرح کسی امر کے رسم ورواج کو اچھا یا برا قرار دے دیں گے۔ بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جب کہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا برائی فی نفسہٖ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اُس طریقے کے تلاش کرنے اور اُسی کے مطابق اپنی رسوم وعادات کی بھلائی یا برائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیے۔

سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور اُن تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں اور اُس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسوم ورواج کے ساتھ برتنی چاہیے تاکہ جو رسم وعادت ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بری ہے اُس کے چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو رسم وعادت دوسروں میں اچھی ہے اُس کو بلا تعصب اختیار کریں اور جو اُن میں بری ہے اُس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔

جب کہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسوم وعادات مروّج ہیں اُنھوں نے کس طرح اُن قوموں میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے اُن رسومات وعادات کے اُن کا مبدا اور منشا متحد معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروّج ہیں اُن کا رواج یا تو ملک کی آب وہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا اُن اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن ومعاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسری قوم کی تقلید واختلاط سے مروّج ہو گئی ہیں یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اُس کو پیدا کر دیا ہے۔ بس ظاہراً یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم وعادات کے مروّج ہونے کا مبدا ومنشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُن کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے اُن کو سکھلائی ہیں۔ جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔

مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے، مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لیے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اُٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریقۂ تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں اور عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے۔ پھر خواہ اس نام سے ہم برا مانیں یا نہ مانیں انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ و تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اُسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔

دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اُس قوم سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اس لیے کہ ہم کو اُس رسم سے تو موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اُس کی حقیقی بھلائی یا برائی پر غور کرنے کا، بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اُس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربے کی ملتی ہیں جو اُس رسم کے اچھے یا برے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادے کے اور اُن کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں، جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی بلکہ بعض اموراتِ مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں یا کوئی نئی رسم مشابہ اُس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے طریقِ معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجے کی تہذیب پر پہنچاویں تا کہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بنظرِ حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظرِ تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں اُن کو چھوڑیں اور جو قابلِ اصلاح ہوں اُن میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالتِ ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں اُن بری رسموں اور بد عادتوں کے چھوڑنے پر مائل ہوں اور جیسا کہ اُن کا پاک اور روشن ہزاروں حکمتوں سے بھرا ہوا مذہب ہے، اُسی طرح اپنی رسوماتِ معاشرت و تمدّن کو بھی عمدہ اور پاک و صاف کریں اور جو کچھ نقصانات اُس میں ہیں گو وہ کسی وجہ سے ہوں، اُن کو دور کریں۔

اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ میں اپنے تئیں اُن بد عادتوں سے پاک و مبرّا سمجھتا ہوں یا اپنے تئیں نمونۂ عاداتِ حسنہ جتاتا ہوں یا خود ان امور میں مقتدا بننا چاہتا ہوں، حاشا و کلا، بلکہ میں بھی ایک فرد اُنھیں افراد میں سے ہوں جن کی اصلاح دلی مقصود ہے، بلکہ میرا مقصد صرف متوجہ کرنا اپنے بھائیوں کا اپنی اصلاحِ حال پر ہے اور خدا سے اُمید ہے کہ جو لوگ اصلاحِ حال پر متوجہ ہوں گے، سب سے اوّل اُن کا چیلا

اور اُن کی پیروی کرنے والا میں ہوں گا۔ البتہ مثل مخمور کے خراب حالت میں چلا جانا اور روز بروز بدتر درجے کو پہنچتا جانا اور نہ اپنی عزت کا اور نہ قومی عزت کا خیال و پاس رکھنا اور جھوٹی شیخی اور بے جا غرور میں پڑے رہنا مجھ کو پسند نہیں ہے۔

ہماری قوم کے نیک اور مقدّس لوگوں کو کبھی کبھی یہ غلط خیال آتا ہے کہ تہذیب اور حسنِ معاشرت و تمدن صرف دنیاوی امور ہیں جو صرف چندروزہ ہیں، اگر ان میں ناقص ہوئے تو کیا اور کامل ہوئے تو کیا اور اس میں عزت حاصل کی تو کیا اور ذلیل رہے تو کیا، مگر اُن کی اس رائے میں قصور ہے اور ان کی نیک دلی اور سادہ مزاج اور تقدّس نے اُن کو اس عام فریب میں ڈالا ہے جو اُن کے خیالات میں اُن کی صحت اور اصلیت میں کچھ شبہ نہیں مگر انسان امور متعلق تمدن و معاشرت سے کسی طرح علیحدہ نہیں ہو سکتا اور نہ شارع کا مقصود اُن تمام امور کو چھوڑنے کا تھا۔ پس اگر ہماری حالتِ تمدّن و معاشرت ذلیل اور معیوب حالت پر ہوگی تو اُس سے مسلمانوں کی قوم پر عیب اور ذلت عائد ہوگی۔ پس ہماری دانست میں مسلمانوں کی حسنِ معاشرت اور خوبی تمدّن اور تہذیبِ اخلاق اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو دنیاوی امور سے جس قدر متعلق ہے اُس سے بہت زیادہ معاد سے علاقہ رکھتا ہے اور جس قدر فائدے کی اُس سے ہم کو اس دنیا میں توقع ہے اُس سے بہت بڑھ کر اُس دنیا میں ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔

(مقالاتِ سرسیّد)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

i- دنیا میں کون سی قومیں مہذب یا تہذیب یافتہ گنی جاتی ہیں؟

ii- ہر قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو کیوں پسند کرتی ہے؟

iii- کیا بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے؟

iv- پرانی رسموں کی پابندی سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

i- جو رسوم و رواج کہ بہ تقاضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں، ان کے صحیح اور درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ii- جن باتوں کی بچپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

iii- یہ بات صحیح نہیں کہ برائی اور بھلائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔

iv- ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بہ سبب اختلاط اور ملاپ اور بغیر مقصد و ارادے کے اور ان کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں۔

3- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:

i- سر سید احمد خاں نے کس صنفِ ادب کو اپنایا؟

ا۔ شاعری ب۔ افسانہ

ج۔ مضمون د۔ آپ بیتی

ii- سرسید احمد خاں نے کس جذبے کے تحت لکھا؟

ا۔ شہرت کی خاطر ب۔ شوق کی خاطر

ج۔ مصروفیت کی خاطر د۔ قوم کی اصلاح کی خاطر

iii- سرسید کے جاری کردہ رسالے کا نام کیا تھا؟

ا۔ مخزن ب۔ تہذیب الاخلاق

ج۔ شاہکار د۔ نیرنگِ خیال

iv- اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کس نے کیا؟

ا۔ شبلی نے ب۔ نذیر احمد نے

ج۔ سرسید نے د۔ حالی نے

4- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدّل آتا ہے۔ نئے الفاظ شامل ہوتے اور پرانے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''جاوے'' اب متروک ہے، اس کی جگہ ''جائے'' لکھا جائے گا۔
اس مضمون میں موجود متروک الفاظ کی فہرست تیار کریں۔

5- ''رسم ورواج'' کا خلاصہ لکھیں۔

6- مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح کریں:

سب سے مقدّم اور سب سے ضروری امر .... اختیار کرنے سے بچتے رہے۔

7- سرسید احمد خاں کے طرزِ نگارش پر نوٹ لکھیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

مولانا الطاف حسین حالیؔ

سالِ ولادت: ۱۸۳۷ء　　　　　　سالِ وفات: ۱۹۱۴ء

مولانا الطاف حسین حالیؔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جن کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے جبکہ والدہ کا تعلق سادات خاندان سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد بلبن کے عہد میں ہرات سے پانی پت میں مقیم ہوئے تھے۔ حالیؔ کے گھریلو حالات بہت خراب تھے۔ حالیؔ ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ پھر جب نو برس کے ہوئے تو والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ والدین کی وفات کے بعد حالیؔ کی پرورش کا بیڑا ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے اٹھایا۔

حالیؔ نے پہلے قرآنِ پاک حفظ کیا۔ بعد ازاں عربی اور فارسی کی طرف توجہ دی۔ ۱۷ برس کی عمر میں رشتہ داروں کے دباؤ میں آ کر حالیؔ اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شادی کے بعد حالیؔ دلّی چلے گئے اور دو برس تک عربی اور صرف و نحو پڑھتے رہے۔ ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر حالیؔ کو ملازمت مل گئی مگر حالات سازگار نہ رہنے کی بنا پر اگلے ہی برس یہ ملازمت ترک کرنا پڑی اور تقریباً چار برس تک بے روزگار رہے۔ پھر حالیؔ پانی پت چلے گئے اور فقہ و حدیث کا مطالعہ کرنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ جہانگیر آباد کے رئیس مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ شیفتہؔ کی صحبت سے حالیؔ کا ذوقِ شعری اور بھی نکھرنے لگا۔ حالیؔ شیفتہ کی صحبت سے تقریباً آٹھ سال تک فیض یاب ہوتے رہے۔ پھر دلی آ کر مرزا غالبؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔ غالبؔ کے انتقال کے بعد حالیؔ لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے اور انگریزی سے اردو تراجم کی عبارت درست کرنے لگے۔ یوں حالیؔ میں انگریزی ادب سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ پھر لاہور ہی میں حالیؔ نے کرنل ہالرائیڈ (ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز) کے ایما پر مولانا محمد حسین آزادؔ کے ساتھ مل کر مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

چار سال لاہور میں رہنے کے بعد حالیؔ دوبارہ دلّی چلے گئے اور اینگلو عربک سکول میں بطور مدرس مقرر ہو گئے۔ انھی دنوں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ حالیؔ سرسید کے افکار سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر سرسیدؔ ہی کی وساطت سے انھیں نظام دکن کی طرف سے ۷۰ روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ ملازمت سے فراغت کے بعد حالیؔ پانی پت میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں انھیں شمس العلما کا خطاب ملا۔

حالیؔ سرسید تحریک کے سرگرم رکن اور علمبردار تھے۔ سرسید کی صحبت نے حالیؔ کے ادبی ذوق کو خوب چمکایا اور علم و ادب کے بے نظیر شاہکار تخلیق کیے۔ ان کی اہم نثری تصانیف یہ ہیں:۔

''مقدمہ شعر و شاعری''، ''یادگارِ غالب''، ''حیاتِ جاوید''، ''حیاتِ سعدی''۔

زیرِ نظر اقتباس ان کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے لیا گیا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کون کون سی شرطیں ضروری ہیں اور شاعری میں وہ کون سی خاصیت ہے جو اس کو غیر شاعر سے ممتاز کرتی ہے۔

شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں

پہلی شرط

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے، قوت متخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں ایمیجی نیشن[1] کہتے ہیں۔ یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ اور جس قدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لیے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اس کا تدارک اس ملکہ سے کرسکتا ہے، لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضے میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ اور ماضی و مستقبل اس کے لیے زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدمؑ اور جنت کی سرگزشت اور حشر ونشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری، عنقا اور آبِ حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کرسکتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو نتیجہ وہ نکالتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہوجاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔

تخیُّل کی تعریف

تخیل یا ایمیجی نیشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے جیسی کہ شعر کی تعریف، مگر من وجہ اس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں تصرف کرتی ہے اور کبھی الفاظ وعبارات میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم ہوتا ہے اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔

دوسری شرط...... کائنات کا مطالعہ

اگرچہ قوتِ متخیلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں

1۔ Imagination

ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی، کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق ومہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانہ میں محفوظ رکھے۔

مختلف چیزوں سے متحد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب کہتے ہیں:

بُوئے گُل ، نالۂ دل ، دُود چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور متحد اشیا سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر ممنون کا یہ شعر ہے:

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنوں

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

غرض کہ یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی شاعر ان سے استغنا کا دعویٰ نہیں کرسکتا کیوں کہ ان کے بغیر قوت متخیلہ کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشوونما پاتی ہے نہیں پہنچتی بلکہ اس کی طاقت آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

قوت متخیلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کرسکتی بلکہ جو مصالح اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے جتنے بڑے بڑے نامور شاعر دنیا میں گزرے ہیں وہ کائنات یا فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں۔ جب رفتہ رفتہ اس مطالعہ کی عادت ہوجاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہوجاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں۔

تیسری شرط...... تفحُّصِ الفاظ

کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحص ان الفاظ کا ہے جن کے ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرنے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔ شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنیِ مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہُو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کرلے۔ اس مرحلہ کو طے کرنا جس قدر دشوار ہے، اسی قدر ضروری بھی ہے۔ کیوں کہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں۔ لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر واستقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کرسکتے ہیں، ان کو ایک ایک لفظ کی قدر وقیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے سے کیا کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظمِ الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہ جاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون سی بات کی کسر ہے۔ جس طرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً چغلی کھاتی ہے، اسی طرح ان کے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ کا بھی فرق رہ جاتا ہے ، معاً ان کی نظر میں کھٹک جاتا ہے۔ اگرچہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے، مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اسی لفظ پر قناعت

کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر کو جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور ان کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالاستقلال حکومت کر سکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ ''شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا، بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لے کر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔''

اس بحث کے متعلق چند امور ہیں، جن کو فکرِ شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا۔ پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورۃً اگر چہ نثر سے متمیز ہو مگر معنے اسی قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے۔ شاعر بشرطیکہ شاعر ہو اول تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اس کو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

(مقدمہ شعر و شاعری)

مشق

1- مولانا حالی نے شاعری کے لیے کیا شرائط ضروری قرار دی ہیں؟

2- سبق ''شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں'' کا خلاصہ لکھیں۔

3- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

i- وہ کون سی ضروری چیز ہے جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے؟

ii- کون سی شے شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے؟

iii- شاعر کی طبیعت میں مشاہدوں کے خزانے کیسے جمع ہوتے ہیں؟

iv- شعر ترتیب دیتے وقت شاعر کو سب سے پہلے کیا کرنا پڑتا ہے؟

v- اکثر بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف کیوں ملتا ہے؟

4- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے جو درست ہیں، ان کے گرد دائرہ لگائیں:

i- حالی کی وجہِ شہرت زیادہ تر کیا ہے؟

ا۔ شاعری ب۔ مضمون نگاری ج۔ افسانہ نگاری د۔ طنز و مزاح

ii- ''مقدمہ شعر و شاعری'' کا تعلق کس صنفِ ادب سے ہے؟

ا۔ شاعری ب۔ افسانہ ج۔ طنز و مزاح د۔ تنقید

iii- حالؔی نے شاعری کے لیے کتنی شرائط ضروری قرار دی ہیں؟

ا۔ دو ب۔ تین ج۔ چار د۔ پانچ

5- مولانا حالی پر مختصر سوانحی اور بطور نثر نگار تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی۔

ii- وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں تصرف کرتی ہے اور کبھی الفاظ و عبارات میں۔

iii- اگرچہ قوت متخیلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے۔ لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخۂ فطرتِ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔

iv- شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لے کر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مطلب لکھیں:

تفحص، تتبع، قوتِ متخیلہ، تدارک، دودِ چراغ محفل

☆☆......☆☆......☆☆

مولانا شبلی نعمانی

سال ولادت: ۱۸۵۷ء سال وفات: ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع بندول میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام محمد شبلی تھا مگر امام ابوحنیفہؒ کی نسبت سے شبلی نعمانی کہلانے لگے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ غازی آباد میں مولانا فاروق سے عربی و فارسی ادبیات اور منطق و فلسفہ پڑھا۔اس کے بعد شبلی رام پور چلے گئے جہاں مولانا ارشاد حسین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔علاوہ ازیں انھوں نے لاہور اور سہارن پور میں ''حماسہ'' اور علم حدیث پڑھا۔انیس برس کی عمر میں شبلی نے حرمین شریفین کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ بھی گئے اور مختلف کتب خانوں کی سیر کے بعد وطن واپس آ کر شعر و ادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

شبلی نے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان بھی پاس کیا مگر ان کا اس پیشے میں جی نہ لگا اور انھوں نے وکالت ترک کر دی۔۱۸۸۱ء میں شبلی کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔اس ملاقات میں سرسید، شبلی کا لکھا ہوا مدحیہ قصیدہ پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔چنانچہ ۱۸۸۳ء میں سرسید نے انھیں عربی اور فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔۱۸۸۷ء میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ہی شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور انھیں عربی سکھائی۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے آرنلڈ کی ہمراہی میں قسطنطنیہ کا دورہ کیا اور دو ماہ تک بلادِ اسلامیہ کی سیاحت میں مشغول رہنے کے بعد واپسی پر ''سفرنامہ روم و مصر و شام'' لکھا۔۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ میں قیام کے دوران میں شبلی ''ندوۃ العلما'' سے وابستہ ہو گئے مگر اس وابستگی کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکے اب وہ ادارہ ''دارالمصنفین'' کے قیام میں لگ گئے اور اپنا سب کچھ علم و ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دینے کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

شبلی ایک عظیم مفکر، نامور مؤرّخ، نقاد، سوانح نگار، تبصرہ نگار، واعظ اور شاعر بھی تھے۔ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات روانی، شگفتگی، ادبی چاشنی، فکر کی گہرائی اور دلیل کے ساتھ بات کرنے کا مؤثر انداز ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا مگر اس کے باوجود نثر کی سادگی، شستگی اور ادبی حُسن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

مولانا شبلی کی اہم تصانیف یہ ہیں:

المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم، الفاروقؓ، سیرۃ النعمان، علم الکلام، الکلام، شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر، سفرنامۂ روم و مصر و شام، مضامین عالمگیر اور سیرۃ النبیؐ۔

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف شروع نہیں ہوئی تھی، جو تعلیم و تعلّم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدت میں...... تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی۔ اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرّجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا مگر رواجِ عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ دیکھو دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے نہ کوئی یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم و فنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں۔ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے ذاتی مکانات ہیں لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے بڑے بڑے عالی شان قصر و ایوان میں بھی، جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔

اگرچہ اس وقت اس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصد کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات تخت گاہوں کی بربادی، سپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین و مجتہدینِ فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر و ہم وطن اہلِ کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر سپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحبِ کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغولِ درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیثِ نبویؐ لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املا جس کو اُردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ اُستاد ایک بلند

مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب العلم جو ہمیشہ قلم و دوات لے کر بیٹھتے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو۔ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھی علماء کے حالات میں ہے جو سپین سے مصر و شام و بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر سپین میں داخل ہوئے۔ جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے۔ بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں تھیں۔ ان میں علما اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علماء کا مخصوص لباس تھا۔

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔

(۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی۔ قرآن و حدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ اتنے تعلق سے نحو، صرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے۔ فلسفے نے علمِ کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہو گی تو اُسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں، مذہب نے ان کو بھی انھی سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔ وزرا، حکام، فوجی افسر، اہلِ منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بو علی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا، حاصل کر سکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرے میں سیکڑوں گزرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا، عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔

سلاطین و وزراء تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے نہیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں خریدا جاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زورِ طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ نصابِ تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔ پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (مراکو) وغیرہ میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق و امثال ذالک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھی کی نذر ہو گیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔ تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا، اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کیے، ان مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔ ایک خاندان کلیتاً برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے، دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو خاں نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرّف نہ کر سکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیے جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈنا چاہیے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۷۴۸ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

(مقالاتِ شبلی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- ''املا'' کس طریقۂ تعلیم کو کہا جاتا تھا؟

ii- کون سی کتاب ''امالی'' کے نام سے مشہور ہوتی تھی؟

iii- ''طیلسان'' کسے کہا جاتا تھا؟

iv- اعلیٰ تعلیم کے لئے کون سی دو چیزیں لازمی خیال کی جاتی تھیں؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا۔

ii- فلسفے نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

iii- وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بو علی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

iv- انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوئے تعلیمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔

v- مضمون میں مذکور تین علمی شخصیات کے نام لکھیں۔

3- سبق میں چند قدیم علوم کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں سے درج ذیل علوم کے بارے میں مختصراً بتائیں:

i- اسماء الرجال ii- تذکرہ iii- طبقات iv- منطق

4- قدیم طرزِ تعلیم کے حوالے سے ''مناظروں'' کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔

5- سبق میں چند ایسے شہروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلامی دنیا میں علم و ادب کے مراکز کے طور پر مشہور تھے' ان کے نام لکھیں۔

6- شبلی کے اسلوب تحریر پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

7- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔

ii- صرف ہم عصر و ہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

iii- اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

iv- امرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔

8- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معنی لکھیں:

تعلیم و تعلم، اسماء الرجال، مستند، ہنوز، نکتہ چیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

طنز و مزاح

طنز اور مزاح دو الگ الگ لفظ ہیں۔ طنز معاشرے کی ناہمواریوں اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ طنز چونکہ تلخ ہوتا ہے اس لیے اس میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے طنز نگار مزاح کا سہارا لیتا ہے تاکہ فرد یا معاشرے پر ہونے والی زیادتیوں کی نشان دہی بھی ہو جائے اور طنز پڑھنے والوں کے لیے طنز قابل مطالعہ بھی بن جائے۔

مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار کیا جائے۔ مزاح نگاری کے لیے موازنہ، زبان و بیان کی بازی گری، مزاحیہ صورت واقعہ، کسی مزاحیہ کردار کی تخلیق اور پیروڈی یعنی تحریف جیسے پانچ حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ طنز اور مزاح میں فرق یہ ہے کہ طنز نفرت اور برہمی سے جنم لیتا ہے جبکہ مزاح محبت اور ہمدردی سے۔ طنز میں زہرنا کی، نشتریت، کاٹ، طعن، عناد، تضحیک اور بعض اوقات جھلاہٹ اور چڑ چڑاپن نمودار ہو جاتا ہے جب کہ مزاح ان سے بری ہوتا ہے اور صرف اپنی لطافت کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ خالص مزاح کو طنز کی ضرورت نہیں لیکن طنز ہر حال میں مزاح کا محتاج ہے۔ طنز لازمی طور پر کسی اصلاحی مقصد کا پابند ہوتا ہے جبکہ مزاح کا مقصد محض مسرت آفرینی بھی ہو سکتا ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ بیان نسبتاً زیادہ پُر اثر اور دل نشیں ہوتا ہے۔

طنز و مزاح ادب کی صنف نہیں بلکہ دو صفات ہیں۔ اس لیے یہ نظم و نثر کی ہر صنف میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں۔ اُردو نثر میں طنز و مزاح کی سب سے پہلی صورت غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ اس کے بعد ''اودھ پنچ'' کے نثر نگار آتے ہیں جن میں منشی سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ، سید محمد آزاد، منشی جواہر پرشاد برق زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مزاح نگاری کے اگلے دور میں تین نام سرِ فہرست ہیں یعنی فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی، ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی، مُلا رموزی اور شوکت تھانوی وغیرہ کا نام آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، امتیاز علی تاج اور کنہیا لال کپور نے بھی مزاح میں نام پیدا کیا۔ جدید دور میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری اور عطاء الحق قاسمی اہم مزاح نگار ہیں۔

احمد شاہ پطرس بخاری

سالِ ولادت: ۱۸۹۸ء سالِ وفات: ۱۹۵۸ء

پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ تھا۔ پطرس بخاری آپ کا قلمی نام تھا۔ ان کے والد کا نام سیّد اسد اللہ تھا۔ پطرس پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے لاہور چلے گئے جہاں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے آنرز کیا۔ انگلستان سے واپسی پر وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر پہنچ گئے۔

قیام پاکستان کے بعد پطرس لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور انگریزی زبان پر غیر معمولی عبور رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں کئی اہم بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کے لیے بھیجا جاتا رہا۔ بعد ازاں حکومتِ پاکستان کی جانب سے انھیں اقوامِ متحدہ کا مستقل مندوب مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ اقوامِ متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ نیویارک ہی میں وہ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو رحلت فرما گئے۔

احمد شاہ پطرس بخاری انگریزی زبان و ادب کے بڑے عالم اور اردو کے منفرد مزاح نگار تھے۔ ان کی تحریروں میں طنز اور مزاح کا بہت عمدہ امتزاج ہے جس میں زبان و بیان کی جملہ خوبیاں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ ان کی تحریر میں کمال کی روانی، شگفتگی اور لطافت کے عناصر ملتے ہیں جو قاری کو عمدہ مزاحیہ تحریر سے بھی آشنا کرتے ہیں اور طنز و مزاح کے مخصوص انداز میں کئی اہم مسائل سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ ان کے مضامین ان کے مخصوص اسلوب نگارش کے علاوہ ان کی وسعتِ مطالعہ کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

"پطرس کے مضامین" ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک زندۂ جاوید مجموعہ ہے جو بہت مختصر ہونے کے باوجود اردو کے مزاحیہ ادب میں بڑا اہم اور باوقار مقام کا حامل ہے۔

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی، لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لیے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں[1] یا کانسرٹوں[2] میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا ''مصنف'' دریافت کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویئے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایت کو اپنا حق سمجھتی اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباء واجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اُس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا' کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اوّل تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا لیکن فرض کیجیے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کو سمجھنے کے لیے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی، میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب مین اس کے لیے دروازہ کھولتا یا اس کے سگریٹ کے لیے دیا سلائی جلاتا' یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لیے خالی کر دیتا، تو وہ میری خدمات کو حقِ نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی کہیے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا' سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدّت کا رنگ دیتا تھا۔

۱۔ Gallary ۲۔ Concert

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا۔
''ہاں اچھی ہے، لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ بری نہیں، بری نہیں۔''

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔
''ہاں پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے' وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔
تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا'
''اس نقاد پر اٹھارویں صدی کے نقادوں کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا' اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ، بہت دلچسپ۔''

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔
اب میں میبل سے نہ دبتا تھا' اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ اگر وہ ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساسِ فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی۔ اب میں اس کے لیے کرسی خالی کرتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔
صراطِ مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں' میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لیے مجھ پر دہری دہری لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ بہرحال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن حقیقت تو یہی ہے نا، کہ میں وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی' میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے' لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ ان ہی دنوں مجھے خفیف انفلوئنزا ہوا، مہلک نہ تھا' بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا' تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی' دوا پلائی' ماتھے پر ہاتھ رکھا' میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا' (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) ''میبل مجھے خدا کے لیے معاف کر دو۔'' اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک

تفصیل بیان کردی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔"

کہنے لگی "نہیں تو۔"

میں نے کہا "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا' کریکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا' وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی "ہاں' پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا!

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

(پطرس کے مضامین)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- مصنف کہاں پڑھتے تھے؟

ii- کیا مصنف کے لیے دس بارہ کتابیں ایک ہفتہ میں پڑھنا ممکن تھا؟

iii- کتابیں پڑھے بغیر مصنف ان پر کیسے رائے زنی کرتا تھا؟

iv- تنقید کی کتابوں کے بارے میں مصنف نے کیا رائے دی ہے؟

v- اپنے گناہ کا اعتراف اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے مصنف نے کیا کیا؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں؟

i- بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا۔

ii- کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباواجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔

iii- تاہم گزشتہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے گناہ گناہِ کبیرہ نظر آنے لگے۔

iv- لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا۔

v- اب میں میبل سے نہ دبتا تھا، اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔

3- مندرجہ ذیل بیانات میں سے درست کے سامنے (✓) اور غلط کے سامنے (×) کا نشان لگائیے:

i- میبل اور مصنف کا مضمون ایک ہی تھا۔

ii- میبل ہفتے میں دس بارہ کتابیں پڑھ لیتی تھی۔

iii- مصنف صرف پڑھی ہوئی کتابوں پر رائے زنی کرتا تھا۔

iv- رفتہ رفتہ مصنف کو تنقید کے فن میں کمال حاصل ہو گیا۔

v- مصنف نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

خلش، مساوات، کائنات، روانی، مکاری۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیں:

خیالات، اوقات، حالات، تفصیلات، حرکات۔

6- ''میبل اور میں'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

7- پطرس بخاری کے اسلوبِ تحریر پر نوٹ لکھیں۔

8- طنز اور مزاح میں کیا فرق ہے؟ مثالوں سے واضح کریں۔

☆☆......☆☆......☆☆

نصیر احمد بھٹی

سال ولادت: ۱۹۴۶ء

نصیر احمد بھٹی ۴ادسمبر کو تلونڈی موسیٰ خاں (ضلع گوجرانوالا) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام علی محمد بھٹی ہے جو اپریل ۱۹۸۴ء میں فوت ہوئے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے ہی میں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالا سے پاس کیا۔ ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحان گورنمنٹ کالج گوجرانوالا سے پاس کیے۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو)، ایم۔اے (سیاسیات) اور بی۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۷۵ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں معاون ماہر مضمون اردو کے طور پر اور ۱۹۹۱ء سے بطور ماہرِ مضمون اردو فرائض انجام دیے اور اردو کی کئی کتابیں اپنی نگرانی میں مرتب کرائیں۔انھوں نے اردو کی بعض کتابوں کی ترتیب وتدوین اور ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

نصیر احمد بھٹی بہت اچھے مضمون نگار ہیں۔ان کے مضمون ''منشیات کی لعنت'' میں عصرِ حاضر کے ایک اہم مسئلے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

نصیر احمد بھٹی

منشیات کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے کائنات اور خاص طور پر اس کرۂ ارضی کی زیبائش و آرائش کے لیے نیلگوں آسمان، چمکتے اور ٹمٹماتے ستارے اور اَن گنت نظام ہائے شمسی تخلیق فرمائے۔ انسان کے استفادے کے لیے جمادات، نباتات، حیوانات، چرند، پرند اور نہ جانے دیگر کتنی فضائی، زمینی اور سمندری مخلوق پیدا کی۔ جمادات ایک جگہ پر قائم ہیں، از خود متحرک نہیں ہو سکتے البتہ حیوانات از خود متحرک ہو سکتے ہیں اور کھاتے پیتے، گرمی سردی کا احساس رکھتے اور نفرت یا محبت کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے احساسات اور جذبات کے نظام کے علاوہ کھرے کھوٹے، اچھے برے، حق اور ناحق میں تمیز کرنے اور کائنات میں موجود انواع و اقسام کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی صلاحیت یعنی عقل و شعور سے بھی نوازا۔ یہی وہ دولتِ بیش بہا ہے جس کی بدولت ابنِ آدم اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ یہی وہ گراں مایہ انعام ہے جس کے استعمال سے انسان ستاروں پر کمندیں ڈالتا، نئی نئی دُنیائیں دریافت کرتا اور فضاؤں کو مسخر کرتا ہے۔ کچھ انسان اس عظیم نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے اس سے کام نہیں لیتے اور زندگی کی مشکلات، ناموافق حالات کا ہمت، جوانمردی اور عقل و ذہانت سے مقابلہ کرنے کی بجائے ہمت ہار کر، خیالی دنیاؤں میں رہنے کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایسی اشیا کا استعمال شروع کر دیتے ہیں جو انھیں وقتی طور پر سکون بخشتی اور دنیا کے جھمیلوں سے کچھ دیر کے لیے پرے لے جاتی ہیں۔ وہ اس وقت اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے کہ ان کے استعمال سے وہ سوچنے سمجھنے، فیصلہ کرنے کی قوت اور جسمانی صحت جیسی نعمت سے محروم ہو رہے ہیں۔ ان اشیا کو ''منشیات'' کا نام دیا جاتا ہے۔

منشیات کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا رہا ہے۔ ہر دور میں ہر نبی اور مصلح نے ان کی مذمت کی ہے۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ کی بعثت سے پہلے عرب معاشرہ شراب نوشی جیسی عادت بد میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور نتیجتاً بات بات پر لڑائی جھگڑا، قتل و غارت، چوری، ڈاکا زنی اور تو اور بچیوں کو اپنے ہاتھوں ماں باپ کا زندہ درگور کر دینا اس معاشرے کا معمول بن چکا تھا۔ دین اسلام نے، جو دینِ فطرت ہے، ان تمام نشہ آور اشیا کی نہ صرف مذمت کی ہے بلکہ شراب کو حرام اور اُم الخبائث قرار دیا گیا ہے کہ اس کے استعمال سے انسان رشتوں کی پہچان تک بھول جاتا ہے، عقل و شعور، حافظہ و یادداشت کھو دیتا ہے۔ دوست اور دشمن کو نہیں پہچان پاتا۔ ایسے میں وہ بدترین جرائم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے۔

سائنسی ترقی کے اس دور میں مسائل زندگی بہت گمبھیر ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں سکون کے چند لمحات کے حصول کے لیے نادانوں نے نشہ آور اشیا کا استعمال عام کر دیا ہے۔ منشیات کی لعنت کے فروغ کا بڑا سبب راتوں رات امیر بننے کی خواہش بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ کاروبار بنا کر پوری دنیا کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشیا عام طور پر نشے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں:

۱۔ ہیروئن:

یہ سفید یا بھورے رنگ کے پاؤڈر کی شکل میں ہوتی ہے جسے افیون سے بنایا جاتا ہے اور ذائقے میں کڑوی ہوتی ہے۔ سگریٹ میں بھر کر اس کے دھوئیں کو سونگھا جاتا ہے۔

اس کے استعمال سے خون کے دباؤ میں کمی واقع ہو جاتی ہے، سانس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور انسان اپنے آپ کو نیند کی سی کیفیت میں محسوس کرتا ہے۔ کسی چیز کو تفصیل سے دیکھنے یا سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر زیادہ مقدار میں استعمال کر لی جائے تو قوت حس کو مزید کم کر دیتی ہے۔ سانس لینے کی رفتار اور دل کی حرکت سست پڑ جاتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ جاتی ہیں۔ نشے باز کو اگر یہ نہ ملے تو دورے پڑتے ہیں، بے ہوشی تک طاری ہو جاتی ہے۔ یہ چونکہ جسم اور دماغ پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے اس سے نشے کی بہت زیادہ لت پڑ جاتی ہے۔ صرف تین چار دن تک روزانہ دو تین سگریٹ پینے سے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر اس سے نجات بہت

مشکل ہو جاتی ہے۔

۲۔ کوکین:

یہ کوکا نامی پودے کی پتیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ جو لاطینی امریکہ میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ سفید رنگ کے پاؤڈر اور بعض اوقات ٹکڑوں کی شکل میں ملتی ہے۔ سگریٹ کی طرز پر پینے کے علاوہ اس کے انجکشن بھی لگائے جاتے ہیں۔

یہ نہایت طاقتور نشہ مرکزی اعصابی نظام کو تیزی سے متحرک کر کے مفلوج بنا دیتا ہے۔ یہ نہایت زود اثر نشہ ہے۔ صرف پندرہ منٹ میں اس کے مضر اثرات نمودار ہو جاتے ہیں اور کم از کم ایک گھنٹے کے بعد اس کا اثر زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ فشار خون بلند ہو جاتا ہے۔ منہ خشک ہو جاتا ہے۔ اس کا عادی اعصابی کشیدگی، تناؤ، قلبی کیفیات میں اچانک ردوبدل، یادداشت کے مسائل، مستقل بے خوابی، وزن کی کمی اور سر درد کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ اتنی مہلک اور خطرناک ہے کہ اس سے پھیپھڑے تو بالکل ناکارہ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ کینابس، چرس اور بھنگ:

پہلی دونوں بھنگ کے پتوں، کونپلوں اور رس ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ کینابس خاکستری، سبز یا سبز بھورے رنگ اور چرس جسے حشیش بھی کہتے ہیں، سیاہ بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔ سگریٹ میں بھر کر پی جاتی ہے۔ بھنگ، بھنگ کے پتوں کو گھوٹ کر مشروب کے طور پر پی جاتی ہے۔

ان نشہ آور اشیا کے استعمال سے انسان کو اپنی حرکات پر قابو نہیں رہتا۔ وہ بہت زیادہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان کو فاصلے کا صحیح اندازہ اور وسعت کا احساس نہیں رہتا ہے۔ چیزوں کے رنگ اور آوازوں میں شدت محسوس ہوتی ہے۔ واقعات کو یاد رکھنے کی صلاحیت، سوچنے اور واضح طور پر بولنے کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اشیا دل کی حرکت اور بلڈ پریشر کو متاثر کرتی ہیں۔ سر چکراتا ہے، بھوک زیادہ لگتی ہے۔ غنودگی طاری رہتی ہے۔ آنکھیں سرخ، منہ اور گلا خشک ہو جاتے ہیں۔ ان اشیا کے استعمال کے عادی اشخاص کا موٹر گاڑی، سائیکل سواری یا کسی مشین پر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کا استعمال منہ، گلے اور پھیپھڑوں کے کینسر کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

۴۔ سکون بخش ادویات:

ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتے ہیں انھیں نشہ آور سکون بخش ادویات کہا جاتا ہے۔ ان کا اثر بالکل خواب آور گولیوں جیسا ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی تجویز کردہ مقدار میں، بتائی گئی خاص مدت تک استعمال کرنے سے کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے بلکہ آرام و سکون ملتا ہے۔ اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ لیکن جب زیادہ عرصے تک مقررہ مقدار سے زائد استعمال جاری رکھا جائے تو انسان کی حرکات میں بے ربطگی، سوچنے کی صلاحیت میں کمی اور یادداشت کو متاثر کرنے جیسے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

خاندان اور سر براہِ خاندان کی ذمّہ داریاں اور طرزِ عمل:

نشہ آور اشیا کے مندرجہ بالا مضر اثرات کے پیشِ نظر ایک خاندان کے ہر عاقل اور بالغ مرد اور خصوصاً خاندان کے سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ وہ گہری نظر رکھے کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد اس بری عادت کا شکار تو نہیں۔ نشے کی لت کے ابتدائی مراحل میں نشہ کرنے والے افراد کے کردار اور جسمانی حرکات میں کچھ بنیادی علامات ظاہر ہوتی ہیں، جیسے صفائی ستھرائی سے لاپروائی، بے وقت سو جانا، وزن میں کمی، بھوک میں اچانک کمی یا اضافہ، نگران یا ساتھیوں سے چپقلش، چڑچڑاپن، موڈ میں اچانک مثبت یا منفی تبدیلی، کمرے میں دیر تک تنہا رہنا، منشیات سے متعلق لٹریچر اور منشیات مارکیٹ سے متعلق زیادہ واقفیت وغیرہ۔ بعض مکانی شہادتیں بھی نشے کی نشان دہی کر سکتی ہیں مثلاً کمرے میں سگریٹ کی پنّی، پائپ، استعمال شدہ ماچس، مختلف پیکٹوں کی موجودگی، عجیب قسم کی بدبو یا اسے دور کرنے کے لیے اگربتی یا

دیگر قسم کی خوشبوؤں کا استعمال وغیرہ۔

جب یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی فرد نشے جیسی بری عادت کا شکار ہو گیا ہے تو یہ مرحلہ سب سے زیادہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ نازک ترین بھی ہے۔ اس وقت اہل خانہ کو غیظ و غضب، طعن و تشنیع کی پالیسی کی بجائے عقل و ہوش سے پوری منصوبہ بندی اور منظم پروگرام سے اس مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ غیظ و غضب، دھمکیوں، مار پیٹ، کمرے میں بند کر دینے اور گھر سے نکال باہر کرنے جیسے ردِ عمل سے معاملہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ سکتا ہے۔

اس وقت محض پردہ پوشی کی بجائے سائنٹیفک طریق کار اپنانا چاہیے کیوں کہ نشے کے عادی افراد کو منشیات کے استعمال کو ترک کرنے کے لیے ہمت، حوصلے اور پختہ ارادے اور خاندان کی پرزور پشت پناہی چاہیے۔ ان کے ذہن سے محرومی، مایوسی، تذبذب اور خوف جیسی کمزوریاں دور کرنے کے لیے صحت مندانہ اور عاقلانہ اقدامات چاہییں۔ منشیات کے نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہی بحالی کی جانب پہلا قدم ہوگا۔ نشہ باز کو نشہ ترک کرنے کے لیے کافی وقت درکار رہتا ہے۔ اس لیے خاندان کے افراد کو جلد بازی اور مایوسانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

معاشرے پر منفی اثرات:

نشہ جہاں ایک شخص کی ذاتی زندگی کو تباہ کرتا ہے، وہاں اس کا پورا خاندان مالی مسائل سے بھی دوچار ہو جاتا ہے۔ یہ شخص نشے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے غیر قانونی کاروبار کرنے پر اتر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات گداگری جیسا ناپسندیدہ دھندا کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ نشہ جہاں ایک شخص اور اس کے خاندان کو متاثر کرتا ہے، وہاں معاشرے میں بہت سی دیگر معاشرتی، سماجی برائیوں اور الجھنوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ اس لیے ایک فرد یا خاندان کی انفرادی کوشش کے ساتھ اس لعنت سے پوری قوم اور ملک بلکہ پوری انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ملکی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی بھرپور اور مربوط کوششوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں درج ذیل عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

عملی اقدامات:

ا۔ بچوں کی تربیت

والدین کو بچوں کی تربیت شروع ہی سے ایسی کرنی چاہیے کہ وہ بڑے ہو کر عملی زندگی میں مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لیے والدین کو بچے کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینا چاہیے۔ کھل کر اظہارِ خیال کرنے کے سلسلے میں بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس طرح انھیں منشیات سے دور رکھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ سکولوں اور کالجوں میں طلبہ و طالبات کو اس لعنت سے روکنے کے لیے صحت مند جسم اور زندگی سے متعلق معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے تاکہ وہ نشے کے برے اثرات کا خود مشاہدہ کر سکیں۔

۲۔ مؤثر تشہیر و ترغیب:

اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مؤثر تشہیر و ترغیب کو حکومتی سطح سے گاؤں کی سطح تک پھیلایا جائے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات و جرائد وغیرہ بڑا مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے منشیات کے نقصانات اور برے اثرات کے متعلق جامع معلومات عوام تک پہنچانے کے لیے ان کا بھرپور استعمال کیا جانا چاہیے۔

۳۔ نوجوانوں کی تنظیمیں:

ملک کے کونے کونے میں نوجوانوں کی تنظیمیں تشکیل دی جائیں جو دل چسپ، مثبت اور تعمیری پروگرام ترتیب دے کر نوجوانوں کو منشیات سے دور رہنے کی ترغیب دے سکیں۔ یہ تنظیمیں صحت مند زندگی کی اہمیت بڑھانے کے لیے ورزش اور کھیلوں وغیرہ پر مبنی پروگرام

ترتیب دے کر نوجوانوں کو منشیات سے دور رکھنے میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔

۴۔ سخت سزائیں:

منشیات کا دھندا کرنے والوں کے خلاف سخت ترین اقدامات کیے جائیں اور انھیں عبرت ناک سزائیں دی جائیں تا کہ ان کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

۵۔ بین الاقوامی فورم کا استعمال:

آخر میں بین الاقوامی طور پر اقوام متحدہ، غیر جانبدار ممالک کی تحریک کے ممبر ممالک، یورپی برادری اور اسلامی ممالک کے مختلف فورم سے اس لعنت کے خلاف، جہاد کے جذبے سے سرشار ہو کر تحریک چلائی جائے۔ اس سلسلے میں تمام ممالک کی تمام تنظیموں کو مربوط کوشش کرنی چاہیے تا کہ پوری انسانیت کو تباہی سے بچایا جا سکے۔

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- اسلام میں منشیات کے بارے میں کیا حکم ہے؟

ii- شراب کو ام الخبائث کیوں کہا گیا ہے؟

iii- منشیات کے کاروبار کے فروغ کی بڑی وجہ کیا ہے؟

iv- منشیات کے خلاف مہم میں سب سے مؤثر کردار کون سا ذریعہ ادا کر سکتا ہے؟

v- جمادات اور حیوانات میں بنیادی فرق کیا ہے؟

2- مندرجہ ذیل بیانات میں سے درست کے سامنے (✓) اور غلط کے سامنے (×) کا نشان لگائیے:

i- منشیات کا استعمال موجودہ دور ہی میں شروع ہوا۔

ii- شراب تمام برائیوں کی ماں ہے۔

iii- نشہ انسان کو ذہنی پریشانیوں سے نجات نہیں دلا سکتا۔

iv- نشہ چھوڑنے کے لیے اہلِ خاندان کو نشہ باز پر سختی کرنی چاہیے۔

v- نشہ باز کو نشہ ترک کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں؟

i- یہی وہ گراں مایہ انعام ہے، جس کے استعمال سے انسان ستاروں پر کمندیں ڈالتا، نئی نئی دریافتیں کرتا اور فضاؤں کو مسخر کرتا ہے۔

ii- نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب معاشرہ شراب نوشی کی عادت بد میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔

iii- دینِ اسلام میں شراب کو حرام اور ام الخبائث قرار دیا گیا ہے۔

iv- ان کا اثر بالکل خواب آور گولیوں جیسا ہوتا ہے۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کا مطلب لکھیں:

ان گنت، جمادات، بعثت، دینِ فطرت، ام الخبائث

5- منشیات کے انسداد کے لیے ہم پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

6- ”منشیات کی لعنت“ کا خلاصہ لکھیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

اردو شاعری پر ایک نظر

اردو شاعری کا آغاز اردو نثر سے بھی پہلے ہوا۔ چنانچہ امیر خسرو دہلوی (جو اردو کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں) کی شاعری کے جو نمونے ملے ہیں' ان میں ایک مصرع فارسی کا اور ایک اردو کا یا آدھا مصرع اردو اور آدھا فارسی میں ہے۔ اس شاعری کو ریختہ کہا جاتا تھا اور اس کا رواج امیر خسرو کے بعد بھی ایک عرصے تک رہا۔

اردو شاعری کو زیادہ ترقی دکن میں نصیب ہوئی۔ بہمنی سلطنت کے قیام سے وہاں اردو کے مقابلے میں فارسی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور وہ سرکاری دفتروں اور تہذیبی مجلسوں میں جگہ پانے لگی۔ دکنی صوفیاء اور عوام خاص طور پر دکنی سلاطین نے زبان اور شاعری کی ترقی میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قطب شاہی خاندان کا سلطان محمد قلی قطب شاہ خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان تھا۔ اس کا اردو کلیات موجود ہے جس میں غزلیں اور قصیدے موجود ہیں۔ اس کی غزلوں میں جہاں ایک طرف فارسی غزل کے مضامین اور اسلوب کی جھلک پائی جاتی ہے وہاں مقامی رنگ بھی ملتا ہے۔ محمود اور فیروز اسی دور کے ایسے شاعر ہیں جن کو بعد کے شعرا نے اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ قطب شاہی دربار کا ایک ممتاز نثر نگار ملا وجہی شاعر بھی تھا۔ اس کی مثنوی قطب مشتری میں چند غزلیں بھی شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا غزل گو بھی تھا۔ ملک الشعرا نصرتی بھی دکنی دور کا قابلِ ذکر شاعر ہے۔ غواصی بھی اسی عہد کا ایک ممتاز شاعر ہے جس کی مشہور تصنیف مثنوی "طوطی نامہ" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شعرا کو مثنوی کی صنف سے زیادہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس دور میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں۔

دکنی دور کے سب سے نامور شاعر ولی ہیں جن کو اردو شاعری کا باوا آدم اور اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سمجھا جاتا تھا۔ بعد کی تحقیق نے اس کی تصدیق نہ کی، پھر بھی ولی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے اردو غزل کو برِصغیر پاک و ہند میں فارسی غزل کے مقابلے میں مقبول اور رائج کیا۔ ولی کے کلام کی دو خصوصیات قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے دکنی محاورے کو ترک کر کے اپنی شاعری میں فارسی اور ہندی الفاظ کا ایک حسین امتزاج پیدا کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اردو غزل کو فارسی غزل سے ملا دیا۔ چنانچہ وہ سارے مضامین چاہے عشق و عاشقی کے ہوں یا تصوف اور حکمت کے' جو فارسی غزل کا سرمایہ تھے اردو میں بلا تکلف داخل ہونے لگے۔ ولی ۱۷۰۰ء میں دلی آئے اور وہاں کے دیگر مشاہیر کے علاوہ شاہ سعد اللہ گلشن سے بھی ملے جنھوں نے ولی کی شاعری کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔

ولی کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں چونکہ فارسی زبان کا غلبہ تھا اس لیے اردو کو محض بولی کی حیثیت سے جانا اور سمجھا جاتا تھا۔ خط و کتابت بھی فارسی زبان میں کی جاتی تھی اور شعر و شاعری کے لیے بھی فارسی زبان ہی مقبول تھی۔ ولی کی شاعری کی شہرت دلی پہنچی اور یہاں کے شعرا نے اس کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس زمانے کے اساتذۂ فن نے فارسی زبان کو ترک کر کے ریختہ میں شاعری شروع کی اور اس زبان کا اسلوب اختیار کرنے لگے۔ اس دور کو عام طور پر ایہام گوئی کا دور کہا جاتا ہے۔ ایہام کے معنی یہ ہیں کہ شعر کی بنیاد کسی ایسے لفظ پر رکھی جائے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب کا ہو اور دوسرا بعید کا۔ شعر پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں قریب کا معنی آئے لیکن غور و فکر کے بعد دور کے معنی سامنے آئیں اور شاعر کی مراد بھی دراصل معنی بعید ہو اور یوں پڑھنے والا ایک تحیّر کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ اس دور کے مشہور شعرا میں شاہ مبارک آبرو' مضمون' شاکر ناجی اور یکرنگ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد شعرا کو اس طرح کی شاعری کے بے اثر ہونے کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اس مذاق شاعری کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ ایسے لوگوں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یوں ایہام گوئی کا دور ختم ہوا۔

ایہام گوئی کے دور کے بعد اردو شاعری اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوئی۔ اس دور کے اکابر شعرا کی فہرست اگرچہ خاصی طویل ہے لیکن اس میں میر تقی میر سرِفہرست ہیں۔ میر تقی میر نے غزل' قصیدہ' مثنوی' مرثیہ' قطعے سب کچھ کہے ہیں لیکن اُن کی شہرت بڑی حد تک ان کی غزل سے ہے اور اس فن میں ان کی استادی کا اعتراف ان کے عہد میں اور ان کے بعد بھی ہر دور کے بڑے بڑے شعرا نے کیا ہے جن میں غالب' ناسخ اور حسرت بھی شامل ہیں۔ میر کی غزلیں ان کے حال کا آئینہ ہیں۔ ان کی زندگی مسلسل کرب' اذیت اور تکلیف کی زندگی تھی۔ مایوسی اور ناکامی ان کی قسمت میں لکھی تھی۔ محبت کی تو

ناکام رہے۔ فارغ البالی اور معاشی اطمینان انھیں زندگی بھر نصیب نہ ہوا۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ عزیز و اقارب نے ایسی سختی برتی کہ آگرہ سے غریب الوطن ہو کر دلی آئے اور پھر لکھنؤ جانا پڑا۔ ایسے شاعر کا کلام اس کے دردِ دل کی تصویر نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔ درد و الم اور سوز و گداز ان کی شاعری کے اجزا ہیں۔ درویشی، قلندری اور تصوف کے مضامین بکثرت ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، ناپائیداری اور گردشِ روزگار کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔ عشق و محبت میں ناکامی اور مایوسی کے مضامین انھیں پسند ہیں اور ان تمام مضامین کو وہ بڑی صفائی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ خیال اور بیان کی سادگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ عام طور پر چھوٹی بحریں پسند کرتے ہیں لیکن طویل بحروں میں بھی بہترین غزلیں موجود ہیں۔ ان سب عناصر نے مل جل کر ان کے کلام کو ایسا اثر بخشا ہے کہ ان کے بعض اشعار نشتر کہلاتے ہیں کہ سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں۔

مرزا رفیع سوداؔ اس دور کے دوسرے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی غزل گوئی کو بعض لوگ ان کے قصائد کے مقابلے میں کم تر درجہ دیتے ہیں۔ غزل اور مثنوی میں بھی اگرچہ ان کے بعض اچھے نمونے موجود ہیں لیکن سودا کا مزاج اور ماحول قصیدے کا تھا۔ انھوں نے بزرگانِ دین کی مدح کے علاوہ اپنے زمانے کے رئیسوں اور امیروں کی شان میں قصیدے لکھے اور قصیدہ نگاری کے فن کے لوازم کو بہترین طریقے سے نبھایا۔ خیال کی بلندی اور زبان و بیان کا شکوہ ان کے قصیدوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں تک پہنچایا۔ اسی لیے انھیں بجا طور پر اردو قصیدہ نگاری کا امام کہا جاتا ہے۔ غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ ان کی چند نظمیں اور ہجویات ایسی بھی ہیں جن سے ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس دور کے تیسرے نامور شاعر خواجہ میر دردؔ ہیں۔ یہ صوفی بزرگ تھے اور دلی میں درویشی کی مسند پر بیٹھے قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاعری کو انھوں نے پیشہ نہیں بنایا لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ منتخب ہے۔ اسی لیے ان کا کلام مختصر ہے۔ ان کی غزلیں عارفانہ کلام کا مثالی نمونہ ہیں۔ توکل، استغنا، ایثار، خود شناسی، خودنگری، تزکیۂ باطن اور خدمتِ خلق کے مضامین ان کے ہاں بار بار ملتے ہیں۔ ان کی غزلیں مختصر ہیں اور زبان و بیان میں سادگی ہے۔

میرؔ و سوداؔ کی شاعری کے اس دور کو دبستانِ دہلی کا دور کہا جاتا ہے کیونکہ بعض خصوصیات اس دور کے تمام شعرا میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود تھیں۔ مثلاً دلی جذبات و احساسات اور ان کے بیان میں جذبے کا خلوص و صداقت، تہذیب و متانت، رمز و کنایہ، تصوف، اظہار کی سادگی اور زبان کی صفائی وغیرہ۔ اس عام انداز کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے کہ دہلوی دبستانِ شاعری داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔

اس دور کے بعد وہ عہد آتا ہے جب دلی میں شاعری کی محفلیں اجڑنے لگیں اور شاعر یہاں سے ہجرت کر کے فیض آباد اور لکھنؤ جانے لگے۔ ان شعرا میں میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ میں یہ زمانہ ایک نئی تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ دولت کی افراط تھی۔ لوگوں کو بڑی حد تک معاشی فارغ البالی نصیب تھی۔ درباروں میں اربابِ فن کی قدردانی ہوتی تھی۔ اس لیے دلی جو مغلیہ سلطنت کے زوال اور مرہٹوں اور سکھوں کی آئے دن کی شورشوں سے شدید بدحالی کا شکار تھا، یہاں سے لوگ ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچ گئے لیکن یہاں پر بعض ایسی روایات پیدا ہو گئیں جو عیش و عشرت اور معاشی فارغ البالی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ شاعری پر جو رنگ صوفیوں اور بزرگوں کی کاوشوں سے چڑھا تھا اور دلی کی تہذیب کی متانت اور سنجیدگی نے جسے ایک حد تک ضبط و نظم کی تعلیم دی تھی، اب لکھنؤ کے درباروں میں رئیسوں کی تفریحِ طبع کا ایک مشغلہ بن گئی۔ شاعری میں اعلیٰ جذبات کی جگہ ہوا و ہوس کے مضامین غالب آ گئے۔ ایسی شاعری نہ اخلاقی اعتبار سے اور نہ ہی جمالیاتی اور فنی اعتبار سے اعلیٰ درجے کی شاعری کہلا سکتی ہے۔ اس دور میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے اور مرثیے سب کچھ کہے گئے۔ غزلوں میں مصحفیؔ کے یہاں کسی قدر سنجیدگی اور انشاؔ کے ہاں اثر آفرین اشعار موجود ہیں لیکن جرأتؔ کو خاص طور پر ایسے مضامین میں شہرت حاصل ہے جنھیں معاملہ بندی کے مضامین کہتے ہیں۔ میر حسنؔ بھی اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں جن کی اصل شہرت ان کی مثنوی ''سحر البیان'' پر قائم ہے۔ جتنی خوبیاں اس ایک مثنوی میں جمع ہیں، اردو میں کسی اور مثنوی میں مشکل سے ملیں گی۔

شاعری کا وہ دور جسے دبستانِ لکھنؤ کا نام دیا جاتا ہے، اس کے بعد کا دور ہے جس میں امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ مشہور ہیں۔ ناسخ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی توسیع و تصحیح کے لیے خاص کوشش کی۔ ہندی اور بھاشا کے الفاظ ترک کر کے فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کرنے کی طرف توجہ دی۔ بہت سے الفاظ کو متروک قرار دیا اور بہت سے الفاظ و محاورات میں مناسب تبدیلیاں کیں اور صرف و نحو کو درست کیا۔ چنانچہ ناسخ کی غزلیں شاندار الفاظ اور تشبیہات سے بھری ہوئی ہیں۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام کا اصل جوہر ہے لیکن ان کے اشعار جذبات و تاثرات سے

خالی ہیں۔ آتش کی شاعری ناسخ کی شاعری سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں اگرچہ لکھنوی شعرا کی سی رنگین مزاجی نہیں ملتی لیکن ان کے ہاں خارجیت کی جانب واضح رجحان ملتا ہے۔ آتش کا لہجہ مردانہ ہے جو زندگی کی حرارت اور عزم سے بھرپور ہے۔ ان کے ہاں غم و درد کا ذکر بہت کم ہے اور وہ بھی زندگی سے مایوسی اور بیزاری نہیں سکھاتا۔

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کے مخصوص رجحان کو کسی قدر گوارا بنانے میں لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا نے اہم کردار ادا کیا۔ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ میں ایسی ترقی نصیب ہوئی کہ اس نے شعرائے لکھنؤ کی خامیوں کی بڑی حد تک پردہ پوشی کر لی۔ مرثیہ گو شعرا ضمیرؔ، دلگیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ انیسؔ اور دبیرؔ خاص طور پر مرثیے کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کے ان ادبی مراکز سے دور آگرے کے نزدیک اکبرآباد میں نظیرؔ نے اپنی ایک الگ دنیا بنا رکھی تھی۔ نظیرؔ نے طویل عمر پائی اور ان کے ہم عصر شعرا میں میرؔ سے لے کر آتشؔ و ناسخؔ شامل ہیں۔ ان سب شعرا کے مقابلے میں نظیرؔ اکبرآبادی کو عوامی شاعر یا انسان دوست شاعر کہا جا سکتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے عوام کو موضوعِ شعر کا مستحق سمجھا اور ان کی زندگی کو پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کی نظموں کے موضوعات کا تعلق ہماری زندگی سے ہے لیکن ان نظموں میں عوامی زندگی کا جو شعور پایا جاتا ہے، اس کی کوئی مثال ان سے پہلے اور ان کے بعد کم ہی نظر آتی ہے۔

اسی دور میں دلی میں ایک بار پھر اردو شاعری نے غالبؔ کے روپ میں اپنا کمال دکھایا۔ مرزا غالب نہ صرف اردو غزل بلکہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی کا ذہن اور شاعر کا مزاج رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کار کی نزاکت بھی۔ خیال اور جذبے کی جیسی ہم آہنگی مرزا غالبؔ کے کلام میں ملتی ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ غالب کی انفرادیت کا سبب محض ان کی مشکل پسندی یا فارسی نہیں بلکہ ان کے ہاں قدم قدم پر مضمون اور اس کے ادا کرنے میں جدّت اور ندرت پائی جاتی ہے، یہی ان کی انفرادیت ہے۔

مومن خاں مومنؔ بھی غالبؔ کے ہم عصر تھے اور ایک کامیاب غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے غزل کے رسمی اور روایتی مضامین کو اس نزاکت، تازگی اور جدّت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ اور ذوقؔ بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ بہادر شاہ ظفرؔ سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرماں روا تھے۔ چونکہ ان کی بادشاہت برائے نام تھی اور وہ ایک درویش مزاج انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے اس لیے ان کے کلام میں حسرت و یاس کے مضامین کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ ذوقؔ نے اگرچہ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا مزاج دراصل قصیدے کا مزاج تھا۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ گوئی میں بڑی شہرت پائی۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب جہاں برصغیر میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں لایا وہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی تبدیلیاں لانے کا باعث بنا۔ لاہور میں انجمنِ پنجاب کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کا مقصد مشرقی زبانوں کی ترقی اور ان کی تعلیم و تدریس تھا۔ اس انجمن کے تحت شاعروں کا عام انداز بدل کر شعرا کو ایک مقررہ موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان شاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی پیش پیش ہوتے تھے۔ یہیں سے اردو شاعری کا دورِ جدید شروع ہوتا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رسمی، روایتی اور فرسودہ عاشقانہ مضامین کی جگہ نئے نئے موضوعات پر ایک حقیقت پسندانہ انداز میں طبع آزمائی کی گئی اور شاعری کو زندگی سے قریب تر لا کر اس کا ترجمان بنانے کی کوشش کی گئی۔ چھوٹی چھوٹی تاریخی، اصلاحی اور حب الوطنی کے موضوع پر نظمیں کہی جانے لگیں جس سے آہستہ آہستہ قومی شاعری کا شعور واضح ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا حالیؔ کی مشہور نظم "مدّ و جزرِ اسلام" جو "مسدسِ حالی" کے نام سے مشہور ہے، قابلِ ذکر ہے۔ حالی کی اس نظم کو اردو میں قومی شاعری کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے جس کا سلسلہ بعد میں اکبرؔ، اقبالؔ اور جوشؔ تک پہنچا۔

اکبرؔ الہ آبادی بھی اس عہد کے شاعر ہیں لیکن اپنے نقطۂ نظر اور مسلک میں وہ خالص مشرقی اور بڑی حد تک روایت پرست نظر آتے ہیں۔ انھیں سرسیّد کا مخالف سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف تھے۔ ان کی شاعری نے قومی زندگی میں مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف ایک کمزور ہی سہی لیکن آواز ضرور بلند کی جس سے آگے چل کر اقبالؔ نے قوت، طاقت اور حرارت حاصل کی۔

اردو شاعری کے دورِ جدید میں اقبال بلاشبہ سب سے ممتاز ہیں۔ان کی شاعری میں نئے موضوعات اور مباحث بھی ہیں اور نیا اسلوب اور آہنگ بھی۔اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں قیام کیا۔اس عرصے میں ان کے خیالات اور افکار میں ایک انقلاب عظیم آیا۔مغربی تہذیب ان کے سامنے بے نقاب ہوگئی۔فلسفہ اور مغربی افکار و خیالات نے ان میں وسعتِ نظر پیدا کی اور ان کی شاعری میں فکری پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ان کے نزدیک عصرِ جدید میں مسلمانوں کے ذہنی انتشار، سیاسی انحطاط اور معاشی بدحالی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے بعض ایسے تصورات کو قبول کر لیا تھا جو روحِ اسلامی کے منافی تھے۔عجمیت، ویدانت کے فلسفے اور بدھ مت کی تعلیمات نے انھیں حرکت و عمل سے دور کر دیا تھا۔اس اندازِ فکر کو انھوں نے نفی خودی کہا ہے۔اقبال کے نزدیک زندگی اثباتِ خودی کا نام ہے اور یہ مسلسل جدوجہد، عزم و استقلال اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔اقبال نے اسی تصور کو بنیاد بنا کر اپنے فلسفۂ خودی کی عمارت کھڑی کی اور اپنی شاعری کو اس طرح قومی راہنمائی کا ذریعہ بنایا کہ وہ برصغیر میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار قرار پائے۔

اس عہد کے ایک اور نامور شاعر مولانا ظفر علی خاں ہیں۔شاعر کے علاوہ وہ صحافی اور سیاستدان بھی تھے۔ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ان کی شاعری کے موضوع عام طور پر سیاسی اور تازہ ترین حالات سے متعلق ہوتے تھے۔اس لیے ان کا کلام وقتی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔انھوں نے نعتیں بھی لکھیں جو اردو کی نعتیہ شاعری میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔

اردو کے دورِ جدید میں جن اکابر شعرا نے نظم کی روایت کو پروان چڑھایا ان میں جوش ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔جوش کے ادبی ورثے میں لکھنؤ کی پوری تہذیب، ادبی مذاق، صحتِ زبان کا لحاظ اور شاعرانہ فنکاری ملتی ہے۔جوش کا کینوس بہت وسیع ہے۔وہ شاعرِ فطرت ہیں، شاعرِ شباب ہیں اور شاعرِ انقلاب ہیں۔ان کے کلام میں ایک جوش اور ولولہ اور ان کے لہجے میں ایک مردانگی اور ان کی فکر میں عہدِ حاضر کا شعور ملتا ہے۔زبان پر جیسی قدرت انھیں حاصل ہے وہ اردو شعرا میں نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے سوا کسی اور میں نظر نہیں آتی۔اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے بھی نظم کی آبیاری میں اہم کام سرانجام دیا۔

جدید نظم کے عام رواج کے بعد غزل کا دور ختم ہوتا نظر آتا تھا لیکن بعض شعرا نے غزل کو موضوع اور اسلوبِ بیان دونوں کے اعتبار سے ایک نئی زندگی عطا کی۔ان شعرا میں حسرت موہانی سرِ فہرست ہیں۔ان کی طبیعت نے پرانے اساتذہ میں سے ہر ایک سے فیض اٹھایا ہے۔عاشقانہ شاعری میں انھوں نے ایسے واقعات اور معاملات بیان کیے ہیں کہ جرات، مومن اور داغ کے رنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔تصوف کے مضامین ادا کرتے ہیں تو درد کی یاد دلاتے ہیں۔ہجر و فراق اور سوز و گداز کے مضامین بیان کرتے ہیں تو میر کا انداز جھلکنے لگتا ہے۔اسی سلسلے کے دوسرے شاعر فانی بدایونی ہیں جن کے کلام میں غالب کا فکری انداز اور میر کا سا سوز و گداز ملتا ہے۔تیسرے شاعر اصغر گونڈوی ہیں جن کا کلام میر درد کی طرح مختصر لیکن منتخب ہے۔جگر مراد آبادی بھی اسی حلقے کے ایک نامور غزل گو ہیں۔ان کی رندی و سرمستی ایک حقیقت ہے اور ان کی غزلیں ان کے حسبِ حال ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔اس تحریک سے وابستہ لوگوں کے نظریات کے پرچار کا ذریعہ شاعری تھا۔چنانچہ ترقی پسند شعرا میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، جان نثار اختر، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی اور حبیب جالب اہم ہیں۔ان لوگوں کے ہاں زیادہ تر جذباتیت پائی جاتی ہے۔ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی اردو شاعری میں آزاد اور معرّیٰ نظم کا رواج ہوا۔آزاد نظم میں وزن تو ہوتا ہے مگر بحر چھوٹی بڑی اور قافیہ نہیں ہوتا۔معریٰ نظم میں بحر موجود ہوتی ہے یعنی ہر مصرع چار ارکان کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔اردو میں اس شاعری کا آغاز اسمٰعیل میرٹھی سے ہوتا ہے۔بعد ازاں ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، فیض، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، اختر الایمان اور مجید امجد زیادہ مشہور ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد نظم کے میدان میں وزیر آغا، عارف عبدالمتین، عبدالعزیز خالد، منیر نیازی، صفدر میر، جیلانی کامران، ظہور نظر، جعفر طاہر، افتخار جالب، عباس اطہر، اختر حسین جعفری، ریاض مجید، آفتاب اقبال شمیم وغیرہ مشہور ہوئے جبکہ غزل گو شعراء میں ناصر کاظمی، احسان دانش، شہزاد احمد، احمد فراز، جمیل ملک، باقی صدیقی، محسن احسان، اختر ہوشیار پوری، عزیز حامد مدنی، احمد مشتاق، ناصر زیدی، کشور ناہید، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

حمد

''حمد'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی تعریف یا ثنا ہیں۔ اصطلاح میں ''حمد'' سے مراد وہ نظم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف یا ثنا بیان کی گئی ہو۔ حمد لکھنے والے کے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر کامل ایمان کے جذبے اور اس کی رحمت پر یقینِ کامل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں شاعر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ پر تقدس موضوع کے باعث حمد میں تقدس کا پہلو غالب ہوتا ہے اور دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں اس کا مقام و مرتبہ بلند ہوتا ہے۔

زمانہ قدیم سے شعری مجموعوں کے آغاز میں برکت کی خاطر حمد شامل کرنے کا رواج رہا ہے مگر بعد میں شعرا نے حمد کی طرف بھرپور توجہ دی تو حمدیہ شاعری کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات بزرگ و برتر پر ایمان' اس کی رحمت پر یقین' اس سے عقیدت' محبت اور اطاعت کے جذبات کی حامل حمدوں کے کئی مجموعے دستیاب ہیں۔

''حمد'' تقدس کی حامل ایک باوقار صنف سخن ہے جس میں شعرا نے فکر و فن کے جملہ تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اپنے ایمان اور تعلق کی کیفیات کو لفظی پیرہن عطا کیا ہے جسے وہ اپنے لیے توشۂ آخرت بھی تصور کرتے ہیں۔

''حمد'' لکھنے والے شاعروں کی تعداد کثیر ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی توجہِ شہرت ہی حمد اور نعت ہے۔ حمدیہ شاعری کے صاحبِ دیوان شاعروں میں مضطر خیر آبادی' مفتی غلام سرور لاہوری' حافظ لدھیانوی' مسعود رضا خاکی' طفیل دارا اور لالہ صحرائی کے نام خصوصاً لائق ذکر ہیں۔

عہدِ موجود میں سے چند حمد نگاروں کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں جن کے حمدیہ شعری مجموعے بھی ہیں............

ع س مسلم' کاوش زیدی' مسرور بدایونی' مظفر وارثی' لطیف اثر' انوار عزمی۔

مولانا ظفر علی خاں

سالِ ولادت: ۱۸۷۳ء　　　　سالِ وفات: ۱۹۵۶ء

مولانا ظفر علی خاں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میرتھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی۔ بعد میں میٹرک کا امتحان پٹیالہ سے پاس کیا۔ پھر انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ایف اے کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد بھی وہیں ملازم تھے۔ ظفر علی خاں زیادہ عرصہ تک سلسلۂ ملازمت جاری نہ رکھ سکے اور دوبارہ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کر لیا۔ بی اے کرنے کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ تک نواب محسن الملک کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

مولانا ظفر علی خاں کے والد نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں کرم آباد سے ہفت روزہ ''زمیندار'' نکالنا شروع کیا تو مولانا نے اس کی ادارت سنبھال لی۔ بعد میں اس کا دفتر لاہور منتقل کر کے اسے ہفت روزہ سے روزنامہ کر دیا۔

ظفر علی خاں نے صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان کے دل میں موج زن ملک و قوم کی آزادی کے جذبے نے انھیں انگریز کے خلاف بغاوت پر مجبور کر دیا۔ مختلف نشیب و فراز دیکھنے کے بعد بحیثیت سیاستدان انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمہ لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ یکے بعد دیگرے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ بالآخر ایک تہلکہ خیز مگر قابلِ تقلید زندگی گزارنے کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو انتقال فرما گئے۔

مولانا ظفر علی خاں بحیثیت انسان بے حد جذباتی مگر شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، دوست نواز اور شفیق بزرگ واقع ہوئے تھے۔ ان کے شعر کہنے کا انداز منفرد تھا۔ وہ حقہ بھروا لیتے اور شعر کہنے بیٹھ جاتے۔ طبیعت کی روانی کا یہ عالم تھا کہ فی کش ایک شعر کے حساب سے لکھتے چلے جاتے۔

مولانا نے کالج کے قومی جلسوں میں نظمیں پڑھیں تو حالی اور شبلی نعمانی نے ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی شاعری کو کمال کے درجہ تک پہنچانے میں معاونت کی۔ وہ قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ کلام میں زبان و بیان اور محاورے کا برمحل استعمال کرتے۔ نئے نئے قافیے باندھنا مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں شعر گوئی ظفر علی خاں کا خاص انداز تھا۔ مولانا زود گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قدرتِ کلام، مشاقی، حاضر دماغی اور آمد کا یہ عالم تھا کہ الفاظ اور مضامین تو گویا ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ نامانوس اور غریب الفاظ کو بھی وہ اس حسن و خوبی کے ساتھ استعمال کرتے کہ شعر کی روانی اور سلاست میں اضافہ ہو جاتا۔

نعت گوئی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ سے سچی محبت اور نعت کے فن کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں سے آشنا ہونے کے باعث نعت کے مضامین ان کے دل کی گہرائی سے نکلتے تھے۔ ان کی نعت کا فکری و فنی مرتبہ بہت بلند ہوتا تھا۔

بڑے بڑے اہلِ زبان مولانا کی زباں دانی کے قائل تھے۔ وہ صرف شعر و شاعری تک محدود رہتے تو اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ مولانا نے حمد، نعت، غزل اور نظم ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور ہر نوع کے موضوعات کو نظم بند کیا جس کے بڑے بڑے نمونے ''بہارستاں''، ''چمنستاں'' اور ''نگارستان'' میں ملتے ہیں۔

نعت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بھی بیان کی۔ ان کی حمدیں بھی اُردو کی حمدیہ شاعری میں مستقل مقام کی حامل ہیں اور ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

حمد

پہنچتا ہے ہر اک میکش کے آگے دورِ جام اُس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اُس کا

گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں، سچا ایک نام اُس کا

ہر اک ذرّہ فضا کا داستاں اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آ کے دیتا ہے پیام اُس کا

نظام اپنا لیے پھرتا ہے کیا خورشید نور افشاں
ہزاروں ایسی دنیاؤں کو شامل ہے نظام اُس کا

میں اس کو کعبہ وبُت خانہ میں کیوں ڈھونڈنے جاؤں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اُس کا

سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اُس کا

مری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اُس کا

ہوئی ختم اس کی حُجت اس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے ان سب تک محمدؐ نے کلام اُس کا

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

مشق

1- ''حمد'' کسے کہتے ہیں؟

2- حمد میں شاعر نے جو خیالات بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

3- مولانا ظفر علی خاں کی حمد کے اس شعر کا مفہوم آسان الفاظ میں لکھیں۔

ے نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

4- ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ مثلاً اس حمد میں جام، عام، نام وغیرہ قافیے ہیں۔ قافیے کے بعد جو الفاظ بار بار جوں کے توں دہرائے جاتے ہیں انھیں ردیف کہا جاتا ہے مثلاً اس حمد میں 'اُس کا' ردیف ہے۔

اس حمد میں آنے والے تمام قافیوں کی نشان دہی کریں۔

5- مولانا ظفر علی خاں پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- مندرجہ ذیل تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں:

سراپا مغفرت، خطا کوشی، خورشید نور افشاں، دورِ جام، خطا پوشی

7- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں:

i- پہنچتا ہے ہر اک میکش کے آگے دورِ جام اس کا

اس مصرع سے شروع ہونے والی حمد کے شاعر کا نام کیا ہے؟

ا۔ اقبال ب۔ حالی
ج۔ بہزاد لکھنوی د۔ ظفر علی خاں

ii- مولانا ظفر علی خاں کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

ا۔ مضمون نگاری ب۔ افسانہ نویسی
ج۔ شاعری د۔ داستان گوئی

iii- تحریر کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں کی دل چسپی کس میدان میں تھی؟

ا۔ تجارت ب۔ سیاست
ج۔ تعلیم و تدریس د۔ طب

iv- اس حمد کے کس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے؟

ا۔ پہلے شعر میں ب۔ دوسرے شعر میں
ج۔ آخری شعر میں د۔ کسی شعر میں بھی نہیں۔

نعت

"نعت"، کا لفظی مطلب ہے "تعریف" یا "توصیف"۔ اصطلاح میں "نعت" سے مراد وہ نظم ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تعریف کی گئی ہو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس صفات اور سیرت پاک کا ذکر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے عقیدت و محبت کے جذبات کا اظہار ہو۔ نعت کے لیے کوئی خاص ہیئت مخصوص نہیں۔ چنانچہ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس، مسدس، آزاد نظم وغیرہ ہر صنف میں نعت کہی گئی ہے۔

نعت گوئی کا آغاز عربی میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک ہی میں ہو گیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت کے نعتیہ قصائد تو عربی زبان کے نعتیہ ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ کعب بن زہیر، امام بوصیری اور احمد شوقی کے نعتیہ قصائد بھی صنفِ نعت میں لازوال حیثیت کے حامل ہیں۔

عربی کے بعد فارسی میں نعت کا آغاز ہوا۔ فارسی نعت کے حوالے سے اہم ترین شعرا عطار، سنائی، انوری، سعدی، عرفی، رومی اور جامی ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ چنانچہ اردو نعت گوئی کی روایت کا سلسلہ بھی فارسی نعت سے ہی جا ملتا ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا نے نعت بھی کہی ہے۔ بعض نے تو تبرکاً نعت کہی جبکہ بعض شعرا نے نعت پر خصوصی توجہ دی۔

خواجہ میر درد، مولانا ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی کی نعت کا اپنا ہی خاص رنگ ہے۔ نعت کے صاحبِ دیوان شاعروں میں سے کچھ اہم شاعروں کے نام یہ ہیں:

محسن کاکوروی، امیر مینائی، احمد رضا بریلوی، حسن رضا بریلوی، ضیاء القادری، اختر الحامدی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، محشر رسول نگری، حافظ مظہر الدین، عارف عبدالمتین، راسخ عرفانی، اقبال عظیم، حافظ لدھیانوی، حفیظ جالندھری، حفیظ تائب، مسرور کیفی، اعظم چشتی، محمد علی ظہوری، صوفی محمد افضل فقیر۔

عہدِ موجود میں نعت کے صاحبِ دیوان شاعروں میں سے چند اہم نام یہ ہیں۔ انور فیروز پوری، عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، راجا رشید محمود، مظفر وارثی، جمیل عظیم آبادی، حنیف اسعدی، حفیظ صدیقی، جعفر بلوچ، ذکی قریشی، ریاض حسین چودھری، ریاض مجید، ضیا محمد ضیا، عاصی کرنالی، علیم ناصری، قمر یزدانی، عاصم گیلانی۔

غیر مسلم شعرا نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے عقیدت و محبت کا اظہار نعت کی صورت میں کیا ہے۔ ان میں سے اہم ترین شعرا کے نام یہ ہیں:

دیا شنکر نسیم، کشن پرشاد شاد، ہری چند اختر، دلورام کوثری، عرش ملسیانی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد۔

امیر مینائی

سالِ ولادت: ۱۸۳۲ء　　　　　　　　　　　　　　　　　　سالِ وفات: ۱۹۰۰ء

''امیر مینائی'' لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام ''امیر احمد'' ہے۔ وہ ایک مشہور صوفی بزرگ شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے۔ انھی کی مناسبت سے وہ ''مینائی'' کہلائے۔ امیر مینائی کے والد ''کرم محمد'' یا ''کرم احمد'' بھی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور فاضل شخص تھے۔ لہٰذا انھوں نے ابتدائی تعلیم انھی سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فرنگی محل کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام مروجہ علوم پر دسترس رکھتے اور خصوصاً عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ تمام علوم پر عبور کا عکس ان کے کلام میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

امیر مینائی بچپن ہی سے شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے معروف شاعر ''مظفر علی اسیر'' کی شاگردی اختیار کر لی۔ فطری ذوق اور استاد کی تربیت کے باعث انھوں نے فن کے اسرار و رموز پر عبور حاصل کر لیا اور بہت تھوڑے عرصے میں اس قدر نام پیدا کر لیا کہ اپنے استاد سے بھی زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ امیر مینائی کی مقبولیت سے متاثر ہو کر نواب واجد علی شاہ نے انھیں اپنے دربار میں بلا لیا۔ اس دور میں انھوں نے ''ارشاد السلاطین'' اور ''ہدایت السلاطین'' کے نام سے دو کتابیں لکھیں اور واجد علی شاہ سے انعامِ خاص حاصل کیا۔ وہ ۱۸۵۶ء تک دربارِ اودھ سے منسلک رہے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد اودھ کی ریاست زوال پذیر ہو گئی تو وہ رام پور چلے گئے جہاں نواب یوسف خاں کی خصوصی توجہ کے سبب بہت مقبولیت حاصل کی۔ قیامِ رام پور کا زمانہ آپ کا زمانۂ عروج تھا۔ نواب یوسف علی کے جانشین نواب کلب علی خان ان کے شاگرد ہوئے۔ داغؔ ان کے ہم عصر اور فن کے معترف و معتقد تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد داغؔ کے ایما پر وہ رام پور سے حیدر آباد چلے گئے اور وہیں پر ۱۹۰۰ء میں انتقال فرما گئے۔

امیر مینائی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ عربی و فارسی کے عالم اور فاضل بھی تھے۔ انھوں نے ''امیر اللغات'' کے نام سے اُردو لغت مرتب کی جو نامکمل رہ گئی۔ ''انتخاب یادگار'' کے نام سے شعرائے رام پور کا تذکرہ ان کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ ''خیابانِ آفرینش'' نثر میں میلاد کی کتاب ہے۔

امیر مینائی صوفی منش انسان تھے۔ ان کے کلام میں تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل گوئی کے علاوہ انھوں نے نعت گوئی پر بھی خصوصی توجہ دی۔ غزلیات کی صورت میں ان کے دو دیوان ''صنم خانۂ عشق'' اور ''مرأۃ الغیب'' ہیں جبکہ نعتیہ دیوان ''محامد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' ہے۔ امیر مینائیؔ کی بعض مثنویاں بھی بہت مشہور ہیں۔ ان میں ''نورِ تجلّی''، ''ابرِ کرم''، ''صبحِ ازل''، ''ذکرِ شاہِ انبیا''، ''شامِ ابد'' اور ''لیلۃ القدر'' بہت اہم اور مشہور ہیں۔

کلامِ امیر مینائی کا غالب پہلو صوفیانہ رنگ ہے۔ چنانچہ انھوں نے نعتیں بھی لکھیں اور مذہبی نکات کو بھی شاعری میں پیش کیا۔ ان کے کلام میں آورد کے مقابلے میں آمد کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے محاورات اور صنائع کو اس عمدگی سے برتا ہے کہ کلام میں کہیں بھی تصنّع پیدا نہیں ہونے دیا۔ شاعری میں الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی محتاط ہو کر کیا ہے اور حتی الامکان سادگی اور روانی کا پہلو پیشِ نظر رکھا ہے۔

امیر مینائی کی اخلاقی شاعری کا ایک پہلو فقر و قناعت کی عکاسی بھی ہے۔ ان کی شاعری میں درد و اثر اور سوز و گداز کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے ہاں گہرے درد کا رچاؤ اور میرؔ کی صدا محسوس ہوتی ہے۔

امیر مینائی نے کسی ایک استاد کی تقلید نہیں کی۔ اس لیے ان کے کلام میں مختلف شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً داغؔ، میر دردؔ اور میر تقی میرؔ وغیرہ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ مجموعی طور پر انھیں اُردو کا ایک نامور شاعر اور اہم نعت گو تسلیم کیا جاتا ہے۔

نعت

یاد جب مجھ کو مدینے کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

خاک چھانیں تو رہِ عشقِ نبیؐ میں چھانیں
ذرّے ذرّے سے یہاں بوئے وفا آتی ہے

غمِ احمدؐ میں مرے دل سے نکلتا ہے دھواں
یا اُمنڈتی ہوئی قبلہ سے گھٹا آتی ہے

روضۂ پاک میں سب ضبطِ نَفَس کرتے ہیں
اس گلستاں میں دبے پاؤں صبا آتی ہے

آپؐ کے عشق میں مرنا بھی عجب دولت ہے
"فَادْخُلُوْا" کی درِ جنت سے صدا آتی ہے

جب میں جاتا ہوں تو اس روضۂ اقدس سے امیرؔ
پھول دامن میں بھرے بادِ صبا آتی ہے

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- نعت کسے کہتے ہیں؟

ii- فضا، ہوا، وفا وغیرہ ہم آواز الفاظ کو کیا کہتے ہیں؟

iii- اس نعت کی ردیف کیا ہے؟

iv- "فادخلوا" کے کیا معنی ہیں؟

2- مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

خاک چھاننا، ضبطِ نفس کرنا، بادِ صبا، فضا

3- امیر مینائی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کریں۔

4- مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کریں:

خاک چھانیں تو رہ عشقِ نبیؐ میں چھانیں
ذرّے ذرّے سے یہاں بوئے وفا آتی ہے

5- مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

i- امیر مینائی کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ا۔ مضمون نگاری ب۔ افسانہ نگاری

ج۔ صحافت د۔ شاعری

ii- شاعری میں امیر مینائی کو کس صنفِ سخن نے شہرت عطا کی؟

ا۔ نظم ب۔ غزل

ج۔ نعت د۔ مثنوی

iii- شاعر نے کس شعر میں اپنا تخلص استعمال کیا ہے؟

ا۔ پہلے شعر میں ب۔ دوسرے شعر میں

ج۔ آخری شعر میں د۔ کسی شعر میں بھی نہیں

iv- جس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص بیان کیا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟

ا۔ مطلع ب۔ مقطع

ج۔ قافیہ د۔ ردیف

6- امیر مینائی کی اور کوئی نعت لکھیں اور اس کے قوافی کی نشاندہی کریں۔

7- کالم (ا) کے مصرعوں کے ساتھ کالم (ب) میں سے مناسب مصرع منتخب کر کے ان کے حرفی نمبر کالم (ج) میں لکھیں۔

کالم (ا)	کالم (ب)	کالم (ج)
ا۔ یاد جب مجھ کو مدینے کی فضا آتی ہے	ا۔ اس گلستان میں دبے پاؤں صبا آتی ہے	
ب۔ جب میں جاتا ہوں تو اس روضۂ اقدس سے امیر	ب۔ سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے	
ج۔ غمِ احمدؐ میں مرے دل سے نکلتا ہے دھواں	ج۔ پھول دامن میں بھرے بادِ صبا آتی ہے	
د۔ روضۂ پاک میں سب ضبطِ نفس کرتے ہیں	د۔ یا امنڈتی ہوئی قبلہ سے گھٹا آتی ہے	

☆☆......☆☆......☆☆

مرثیہ

مرثیہ عربی زبان کے لفظ "رثا" سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ماتم ہیں لیکن اصطلاح میں مرثیہ ایک صنفِ سخن ہے جس میں کسی شخص کے دنیا سے اٹھ جانے پر اپنے جذباتِ غم کا اظہار کیا جاتا ہے اور مرحوم کی خوبیوں کو بیان کر کے اُسے خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً غالب کی وفات پر مولانا حالی نے اپنی والدہ کی وفات پر علامہ اقبال نے مرثیہ لکھا۔ مرثیے کے اس عام مفہوم کے علاوہ اردو میں مرثیے کا ایک خاص مفہوم بھی ہے یعنی شہدائے کربلا کا مرثیہ۔ شہدائے کربلا کا مرثیہ بنیادی طور پر مذہبی مزاج رکھتا ہے اور مجالسِ عزا میں پڑھے جانے کے لیے لکھا جاتا ہے۔

مرثیے کو مندرجہ ذیل نو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(i) چہرہ: مرثیے کی ابتدا یا تمہید کو چہرہ کہتے ہیں۔ اس میں شاعر حمد، نعت یا منظر کشی کے مضامین باندھتا ہے۔

(ii) سراپا: اس میں شاعر اپنے ممدوح کا تعارف کراتا ہے اور اس کی مختلف خوبیاں بیان کرتا ہے۔

(iii) رخصت: اس حصے میں شاعر اپنے ممدوح کی میدانِ جنگ کی طرف روانگی کا منظر پیش کرتا ہے۔

(iv) آمد: اس میں شاعر اپنے ممدوح کی میدانِ جنگ میں آمد کا سماں پیش کرتا ہے۔

(v) رجز: اس حصے میں شاعر کا ممدوح میدانِ جنگ میں پہنچ کر دشمن کے سامنے اپنی عظمت، خاندانی وقار و بلندی اور اپنے مقصد کی صداقت وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور اُسے راہِ حق اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

(vi) جنگ: اس حصے میں شاعر اس جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے جو شاعر کے ممدوح اور اس کے دشمنوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس حصے میں ممدوح کے گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

(vii) شہادت: اگر جنگ میں شاعر کا ممدوح شہید ہو جائے تو اس حصے میں اس کی شجاعت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کی شہادت کے واقعات کا بیان بھی کیا جاتا ہے۔ شہادت کے واقعات عام طور پر نہایت جذباتی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(viii) بَین: اس حصے میں ممدوح کے عزیز و اقربا اس کی شہادت پر انتہائی جذباتی انداز میں اظہارِ غم کرتے ہیں۔

(ix) دعا: اس حصے میں شاعر خاص طور پر شہدائے کرام اور پھر ملتِ اسلامیہ کے تمام افراد کے لیے بلندیٔ درجات کی دعا کرتا ہے اور یوں اس دعا پر مرثیے کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اردو زبان میں مرثیہ نگاری کا آغاز دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ سے ہوا جہاں کے عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے بانی عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ وجہی، غواصی، لطیف، کاظم، شاہی اور ہاشم اس دور کے مشہور مرثیہ نگار تھے۔ شمالی ہند میں اگرچہ سودا سے پہلے بھی بعض مرثیہ گو شعرا کے نام ملتے ہیں لیکن سودا نے مرثیہ گوئی کے فن کو بعض نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ کو نہایت ساز گار فضا میسر آئی۔ یہاں پر خلیق اور ضمیر کے بعد انیس اور دبیر کے نام مرثیہ نگاری کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان دونوں شاعروں نے مرثیہ نگاری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

میر ببر علی انیسؔ

سالِ ولادت: ۱۸۰۰ء　　　　　سالِ وفات: ۱۸۷۴ء

ممتاز مرثیہ گو میر ببر علی انیسؔ فیض آباد کے ایک معروف علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام ببر علی اور انیسؔ تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام میر خلیق تھا۔ میر خلیق اپنے وقت کے مشہور مرثیہ گو شاعر تھے جب کہ ان کے دادا میر حسن (مثنوی سحر البیان کے خالق) صاحب دیوان شاعر اور مشہور مثنوی نگار تھے۔ میر انیسؔ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی جبکہ مشق سخن کے لیے اپنے والد سے تربیت پائی۔ کچھ عرصہ فیض آباد میں قیام پذیر رہنے کے بعد انیسؔ کا پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جنگ آزادی کے بعد جب واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا تو میر انیسؔ عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ کچھ وقت حیدر آباد دکن میں گزارنے کے بعد آخری عمر میں پھر لکھنو واپس چلے گئے اور وہیں ۱۸۷۴ء میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

میر انیسؔ انتہائی خود دار اور وضع دار انسان تھے۔ انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں مرثیے، سلام، قطعات و رباعیات رقم کیں۔ ان کے مرثیوں کی پسندیدگی و شہرت کا یہ عالم تھا کہ میر انیسؔ کی مجلس میں ہزاروں ارادت مندوں کا اجتماع رہتا تھا۔

میر انیسؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ حسنِ اسلوب کے اعتبار سے میر انیس کے مرثیوں میں بہت روانی، تنوع، رنگا رنگی، کلام کی صفائی، لطفِ زبان اور ذخیرۂ الفاظ پایا جاتا ہے۔ میر انیس کے مرثیے محاکات نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ "شوق شہادت" میں جو ایک طویل مرثیے کا ایک مختصر سا اقتباس ہے، یہ سارے اوصاف بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ مرثیہ نگاری میں میر انیس نے اپنے فن کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ بس انھی کا حصہ ہے۔ میر انیس کی فنی عظمت کو تمام بڑے بڑے نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ ان جیسا مرثیہ گو مرثیے کی ساری تاریخ میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مجالس میں بالعموم میر انیس ہی کے مرثیے پڑھے جاتے ہیں جو اپنی اثر آفرینی اور کمال کی منظر نگاری کے باعث عقیدت، محبت اور ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں۔

شوقِ شہادت

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے ` جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھا سُوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہراؑ کے لال کا گذری شبِ فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبحِ مبارک ہے جس کی شام یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہونچ جائیں تشنہ کام لکھے ذرا نماز گزاروں میں سب کے نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اُٹھے
دنیا سے جو شہید اُٹھے سرخرو اُٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس باندھے عمامہ آئے امامِ زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور خوف و ہراس رنج و کدورت دلوں سے دور
فیّاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بو
غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو پرہیز گار و زاہدِ ابرار و نیک خو
پتھر میں ایسے لعل صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا کہ ملک ہیں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب ‏ ‏ پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب ‏ ‏ ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی، صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئنوں میں جلا اور ہو گئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوش خصال ‏ ‏ جن میں کئی تھے حضرتِ خیرالنسا کے لال
قاسم سا گلبدن، علی اکبر سا خوش جمال ‏ ‏ اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال
سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

مشق

1- مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ مرثیہ کے اجزاء تفصیلاً بیان کریں۔
2- میر انیس کی مرثیہ نگاری پر نوٹ لکھیں۔
3- مرثیہ میں جو منظر پیش کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
4- مرثیہ کے پہلے بند کی تشریح کریں۔
5- جس نظم کے ہر بند کے چھ مصرے ہوں اسے مسدّس کہتے ہیں۔ مسدس کے ابتدائی چار مصرے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ آخری دو مصرے اپنے طور پر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ میر انیس کا یہ مرثیہ ہیئت کے اعتبار سے مسدّس ہے۔ اپنی کتاب میں سے مسدّس کی کوئی اور مثال تلاش کر کے لکھیں۔
6- اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ واضح کریں۔
قطع، فلک، حمد، فکر، ابر
7- درست بیان کے سامنے (✓) اور غلط بیان کے سامنے (×) کا نشان لگائیں۔
i- ''شوقِ شہادت'' میر انیس کا لکھا ہوا مرثیہ ہے۔
ii- میر انیس نے مرثیے کے علاوہ قصیدے بھی لکھے۔
iii- ''شوقِ شہادت'' ہیئت کے اعتبار سے مسدس ہے۔
iv- میر انیس کی وجہِ شہرت مرثیہ نگاری ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

نظم

نظم کے عام مفہوم کے مطابق اگر چہ ہر منظوم کلام نظم ہے لیکن نظم کے ایک محدود معنی بھی ہیں جن کے مطابق نظم ایک صنف سخن ہے جو اشعار کا ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس میں ایک مرکزی خیال ہو، کوئی موضوع ہو اور فلسفیانہ، بیانیہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ داخلی اور کچھ خارجی دونوں قسم کے تاثرات پیش کیے ہوں۔

نظم کے لیے مسمّط کا لفظ بھی آتا ہے جس کا معنی ہے "موتیوں کی لڑی"۔ اصطلاح میں اس سے مراد کوئی ایسی نظم ہوتی ہے جس کے مختلف بند ہوں۔ ہر بند مختلف مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر تین مصرعوں کا بند ہو تو اُسے مثلّث کہا جائے گا۔ چار مصرعوں کا بند ہو تو اُسے مربّع کہا جائے گا، پانچ مصرعوں کے بند کو مخمس اور چھ مصرعوں کے بند کو مسدّس کہا جائے گا۔ اگر مصرعوں کی تعداد آٹھ یا دس ہو تو ایسی نظم کو بالترتیب مثمّن اور معشّر کا نام دیا جاتا ہے اور ترکیب بند یا ترجیع بند بھی کہتے ہیں۔ ترکیب بند وہ طویل نظم ہوتی ہے جس کے کئی بند ہوں اور ہر بند میں چار، پانچ، چھ یا سات اشعار ہوں اور آخر میں ایک ٹیپ کا شعر ہو۔ ترجیع بند کی ہیئت بھی ترکیب بند کی طرح ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بدل جاتا ہے جبکہ ترجیع بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بار بار دہرایا جاتا ہے اور وہ ہر بند کے اختتام پر آتا ہے۔

اردو ادب میں نظم گو شعرا میں نظیر اکبر آبادی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے بھی بہت سی نظمیں لکھیں۔ علامہ اقبال بھی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کے بعد جن شعرا نے نظم گوئی کی طرف خاص توجہ دی ان میں چکبست لکھنوی، سیماب اکبر آبادی، تاجور نجیب آبادی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، اختر شیرانی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض اور مجید امجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظیر اکبرآبادی

سالِ ولادت: ۱۷۳۵ء سالِ وفات: ۱۸۳۰ء

نظیر اکبرآبادی پہلے عوامی شاعر ہوئے ہیں۔ ان کا اصل نام سید محمد ولی اور تخلص نظیر تھا۔ وہ اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے اکبرآبادی کہلائے۔ ان کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا جن کا شمار آگرہ کے شرفا میں ہوتا تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باعث ان کی پرورش بہت ناز و نعم میں ہوئی۔ زمانے کے دستور کے مطابق نظیر اکبرآبادی نے تعلیم کا آغاز عربی اور فارسی سے کیا۔ عربی اور فارسی میں ان کے استاد مولوی محمد کاظم اور ملا ولی محمد تھے جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان سے نظیر نے عربی تو تھوڑی بہت ہی سیکھی مگر فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیا اور فنِ کتابت میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

نظیر اکبرآبادی نے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا اور کبھی کسی امیر کی ملازمت نہ کی اور نہ ہی کبھی دیگر شعرا کی طرح کسی دربار سے وابستہ ہوئے بلکہ ساری زندگی نہایت خودداری اور قناعت سے بسر کی۔ نظیر اکبرآبادی قانع، وسیع المشرب اور آزاد منش انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ہندی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی رسومات کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ آخری عمر میں نظیر فالج کا شکار ہو گئے اور بالآخر اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا۔

نظیر اکبرآبادی بنیادی طور پر نظم گو شاعر تھے مگر انھوں نے غزل بھی کہی اور مسدس، مخمس اور قطعات میں بھی طبع آزمائی کی۔ نظیر کو اردو کا پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا تصورِ انسان بہت وسیع تھا۔ آپ انسانوں کی طبقاتی تقسیم کے بڑے مخالف تھے۔ نظیر کی نظموں میں عوامی زندگی کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ انھوں نے شعر و سخن کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا تعلق براہِ راست عوام الناس بالخصوص غریب اور مفلس طبقے سے تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے ساری عمر عوام میں بسر کی اور خواص کے طبقے کے ساتھ کبھی کوئی تعلق نہ رکھا۔

نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں مناظرِ فطرت، مذہبی تہوار، سماجی رسوم، میلوں ٹھیلوں، جانوروں حتیٰ کہ پھلوں اور سبزیوں کا جا بجا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نظیر کے ہاں موضوعات کا تنوع اور فطرت کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی نظمیں مناظرِ فطرت، جزئیات نگاری، سراپا نگاری اور اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ نظیر اکبرآبادی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع تھا جسے وہ جس رنگ میں چاہتے ڈھالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی نظموں میں سے لطفِ شباب، آدمی نامہ، ہنس نامہ، شبِ برات، بسنت، ہولی، بلبلوں کی لڑائی، گلہری کا بچہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بلاشبہ نظیر اکبرآبادی کی شاعری اردو شاعری کی تاریخ میں بہت منفرد اور اہم مقام کی حامل ہے اور اس عہد میں جب نظم کہنے کا رواج ہی نہ تھا نظمیں لکھنے کا آغاز کر کے انھوں نے اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا اور نظم نگاری کی راہ ہموار کی۔

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا، برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر، ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں ، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے ، سبزا ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں، ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں، پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیئے ہیں حق نے، کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ ، کچھ ابر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں ، سرخ و سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر ، لے ماہ تا بماہی
یہ رنگ کون رنگے ، تیرے سوا الٰہی
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یارب، سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا، ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں، پہچان تیری قدرت
تیتر پکارتے ہیں ، سبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خرد و کبیر خوش ہیں
ادنیٰ، غریب، مفلس، شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرم ، عاشق اسیر خوش ہیں
جتنے ہیں اب جہاں میں، سب اے نظیر خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو ، برسات کی بہاریں

مشق

1- شاعر نے "برسات کی بہاریں" میں جو برسات کا منظر بیان کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

2- نظم کے پانچویں بند کی تشریح کریں۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

گلزار، قدرت، پیان، مفلس، بہاریں

4- نظیر اکبر آبادی پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

5- جس نظم کے ہر بند کے پانچ مصرعے ہوں اسے مخمس کہتے ہیں۔ ان پانچ مصرعوں میں پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ پانچویں مصرعے کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے کسی اور مشہور مخمس کا عنوان لکھیں۔

6- مخمس کے ہر بند کا پانچواں مصرع یا مسدس کے ہر بند کا تیسرا شعر من وعن دہرایا جائے تو مخمس میں اسے ٹیپ کا مصرع اور مسدس میں ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔ ٹیپ کا مصرع یا شعر بات میں زور پیدا کرنے کے لیے دہرایا جاتا ہے۔ "برسات کی بہاریں" میں ٹیپ کے مصرع میں شاعر کیا بات سمجھانا چاہتا ہے؟

7- مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

i- "برسات کی بہاریں" کے شاعر کا نام کیا ہے؟

ا۔ اسمٰعیل میرٹھی ب۔ حالی

ج۔ نظیر اکبر آبادی د۔ اکبر الہ آبادی

ii- نظیر اکبر آبادی کی وجۂ شہرت کیا ہے؟

ا۔ شاعری ب۔ درس وتدریس

ج۔ تجارت د۔ سیاحت

iii- نظیر اکبر آبادی نے عام طور پر کس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی؟

ا۔ غزل ب۔ نظم

ج۔ قصیدہ د۔ مرثیہ

iv- نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا نمایاں پہلو کیا ہے؟

ا۔ مزاح ب۔ مشکل الفاظ کا استعمال

ج۔ منظر نگاری د۔ تراکیب کا زیادہ استعمال

☆☆......☆☆......☆☆

علامہ محمد اقبالؒ

سالِ ولادت: ۱۸۷۷ء　　　　سالِ وفات: ۱۹۳۸ء

محمد اقبال نام اور تخلص بھی اقبالؔ ہی تھا۔ علامہ اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا اور والدہ کا امام بی بی تھا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرنے کے بعد اقبال مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں خوش قسمتی سے انھیں مولوی میر حسن جیسے شفیق استاد مل گئے جن سے انھوں نے بہت فیض حاصل کیا۔ مرے کالج سے ایف اے کرنے کے بعد اقبال لاہور چلے آئے اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں اقبالؒ کو مسٹر ٹامس آرنلڈ جیسے مشفق استاد اور رہنما کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بھرپور موقع میسر آیا۔ یہیں سے انھوں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور پروفیسر فرائض انجام دیتے رہے مگر جستجوئے علم انھیں ۱۹۰۵ء میں یورپ لے گئی۔ قیامِ یورپ کے دوران میں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ علاوہ ازیں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے فلسفہ ایران کے فلسفۂ مابعد الطبیعیات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس آ گئے اور اپنی شاعری کے ذریعے ملک و قوم کی اصلاح اور خدمت میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۲۲ء میں اقبالؒ کو سرکارِ برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا۔ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی اور شاعری کے علاوہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور آزادیِ وطن کے لیے عملی جد و جہد میں مصروف رہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ عظیم شاعر، فلسفی اور قومی رہنما، راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں پُر اثر اور پُر سوز شاعری کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا مگر بعد میں زیادہ تر توجہ نظم نگاری کی جانب مبذول کر دی کیونکہ قوم تک اپنا پیغام پہنچانے کا یہ زیادہ مؤثر ذریعہ تھا۔ اقبال کا دائرۂ فکر، مشاہدہ کائنات اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سچے عاشق تھے اور اس چاہت اور عقیدت کا اظہار جابجا ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبالؒ نے محض روایتی عشق و عاشقی کے موضوعات سے ہٹ کر اپنی شاعری میں زندگی، کائنات، خدا، ابلیس، عقل و خرد، تصوف، قومیت، مردِ مومن، سیاست و مملکت اور خودی و بے خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ جیسا عظیم شاعر و فلسفی آج تک پیدا نہ ہو سکا۔

''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ان کی اردو شاعری کی کتابیں ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں بھی کچھ اردو نظمیں شامل ہیں جبکہ اس کا غالب حصہ فارسی میں ہے۔

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی مظہرِ شانِ کبریا ہوں، میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

☆☆☆

جاوید کے نام
(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

شاہین

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت ، خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ بادِ بہاری ، نہ گلچیں ، نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں مَیں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب ، یہ پچھم ، چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں مَیں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

☆☆☆

پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

مِلّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

☆☆☆

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں؟

i- ''شاہین'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

ii- ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

iii- عقل اور دل نے اپنی اپنی بڑائی کا کیا جواز پیش کیا ہے؟

iv- ''عقل و دل'' کا مرکزی خیال لکھیں؟

v- دیارِ عشق سے کیا مراد ہے؟

vi- شاخ بریدہ سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟

vii- آپ کے خیال میں عقل کی اہمیت زیادہ ہے یا دل کی؟

viii- ''شیشہ گرانِ فرنگ'' سے کیا مراد ہے؟

ix- جاوید کے نام خط میں علامہ اقبال نے اسے کیا تلقین کی ہے؟

x- اقبال نے کس دل کو دلِ فطرت شناس کہا ہے؟

2- عقل و دل کا خلاصہ لکھیں۔

3- علامہ اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیں۔

4- علم بیان کی اصطلاح میں نظم یا نثر میں کسی مشہور قصے، واقعے، روایت، حدیث یا کلام پاک کی کسی آیت کی طرف اشارہ کیا جائے تو اسے تلمیح کہتے ہیں۔ چنانچہ ''خضر'' اور'' طائرِ سدرہ'' تلمیحات ہیں۔ ان کی وضاحت کریں۔

5- مندرجہ ذیل شعری تراکیب کی وضاحت کریں۔

مثلِ خضرِ نجستہ پا۔ کتابِ ہستی۔ مظہرِ شانِ کبریا۔ غیرت لعلِ بے بہا۔ رازِ ہستی۔
خدا جُو۔ فصلِ خزاں۔ زرِ کامل عیار۔ شیشہ گرانِ فرنگ۔ خدا نما۔

6- خالی جگہ پر کریں:

i- ....کی انتہا ہے بے تابی

ii- اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے..........

iii- خیابانیوں سے ہے پرہیز..........

iv- پرندوں کی دنیا کا..........ہوں میں

v- پیوستہ رہ شجر سے امید..........رکھ

7- علامہ اقبال کی نظم ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کا تنقیدی جائزہ لیں۔

8- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے جو درست ہیں، اس پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ''عقل و دل'' کس شاعر کی نظم ہے؟

ا۔ اسمٰعیل میرٹھی کی　ب۔ اکبر الٰہ آبادی کی　ج۔ نظیر اکبر آبادی کی　د۔ علامہ اقبال کی

ii- ''جاوید کے نام'' کس شاعر کی نظم ہے؟

ا۔ اسمٰعیل میرٹھی کی　ب۔ اکبر الٰہ آبادی کی　ج۔ نظیر اکبر آبادی کی　د۔ علامہ اقبال کی

iii- علامہ اقبالؒ کی زیادہ تر وجہِ شہرت کیا ہے؟

ا۔ پروفیسری　ب۔ وکالت　ج۔ سیاست　د۔ شاعری

iv- جاوید کا خط علامہ اقبال کو کہاں وصول ہوا؟

ا۔ لاہور میں　ب۔ لندن میں　ج۔ کیمبرج میں　د۔ میونخ میں

☆☆......☆☆☆......☆☆

خوشی محمد ناظؔر

سالِ ولادت:۱۸۶۹ء سالِ وفات:۱۹۴۴ء

خوشی محمد ناظر ۱۸۶۹ء میں ''ہریاوالا'' ضلع گجرات کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کا اصلی نام خوشی محمد اور ناظر تخلص ہے۔ والد کا نام چودھری مولا داد تھا۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسے اور ثانوی تعلیم گجرات میں حاصل کی۔ان کی غیر معمولی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ابتدائی و ثانوی تعلیم کے دوران میں گاؤں کے فارسی مکتب میں بھی تعلیم پاتے رہے اور فارسی درسی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میٹرک کے امتحان میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر رہے۔

۱۸۸۹ء میں انھوں نے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا جہاں ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی اور انگریزی میں آنرز کیا۔تمام مسلمان طلبہ میں اول آنے کا اعزاز حاصل کرنے کی بنا پر انھیں طلائی تمغہ اور اور پورے کالج میں اوّل آنے پر ایک اور طلائی تمغہ بھی دیا گیا۔

علی گڑھ کالج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک ''ریونیو منسٹر'' کے پرسنل اسسٹنٹ رہے اور ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے خود ''ریونیو منسٹر'' کے عہدے تک پہنچ گئے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد انھوں نے پینشن لے لی۔اس کے بعد نواب رام پور کے اصرار پر پانچ سال ریاست رام پور میں خدمات سرانجام دیں۔۱۹۲۹ء میں انھوں نے ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں چک جھمرہ میں رہائش اختیار کر لی۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو سری نگر میں انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

ناظر نے شاعری کا آغاز قیامِ علی گڑھ کے دوران میں حالی اور پروفیسر آرنلڈ کی ادبی صحبتوں میں رہ کر، نیچرل شاعری کے انداز میں نظمیں لکھ کر کیا۔ آرنلڈ نے نیچرل شاعری کی ترقی و ترویج کے لیے دو سال تک بہترین نظم کے لیے انعام کا اعلان کیا تو دونوں مرتبہ ہی یہ انعام ناظر نے حاصل کیا۔انھوں نے انجمن حمایتِ اسلام کے کئی سالانہ جلسوں میں قومی نوعیت کی نظمیں پڑھیں جن میں ''درسِ عشق''، ''تصویرِ عبرت''، ''آیاتِ بینات'' خصوصاً لائقِ ذکر ہیں۔

قیامِ کشمیر (۱۹۰۱ تا ۱۹۰۶) کے دوران میں مناظرِ فطرت کی دلکشی اور رنگینی نے ناظر کو شاعرِ رنگیں نوا بنا دیا۔ اس دور کی نظموں میں ''فردوس زمیں''، ''پانی میں لمو دری''، ''شمشاد''، ''چنار''، ''کانگڑی'' اور ''جوگی'' اعلیٰ پائے کی یادگار نظمیں ہیں۔

نظم ''جوگی'' ناظر کی بہترین اور مقبول ترین نظم ہے جو نیچرل شاعری کی بڑی عمدہ مثال ہے۔فنی ہیئت کے اعتبار سے یہ ترکیب بند ہے جو دو حصوں ''نغمہ حقیقت'' اور ''ترانہ وحدت'' پر مشتمل ہے۔نظم میں عنوان اور موضوع کی مناسبت سے ہندی کے شیریں الفاظ کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔نظم میں انداز کی دل کشی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ناظر کے کلام میں جدید شاعری کے تمام لوازمات موجود ہیں۔نمایاں خصوصیات منظر نگاری اور بیان کا فطری انداز ہے جس میں سادگی اور اثر آفرینی بھی ہے اور موضوع کی نسبت سے تفصیلات کے بیان کی قدرت بھی۔

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے، جب عالم بُقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے، خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی، جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی، وادیٔ ایمن تھی، ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے، مستانہ وہ تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے، گلزار بھی بزمِ سرور ہوا
تھا دل کش منظرِ باغِ جہاں اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

☆☆☆

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے، پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے، کہرے نے قنات لگائی تھی
اک مست قلندر جوگی نے پربت پر ڈیرا ڈالا تھا
تھی راکھ جٹا میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ، وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ، آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا
تیکھے چتون سے جوگی نے تب ناظرؔ سے یہ کلام کیا

☆☆☆

کیوں بابا! نا حق جوگی کو تم کس لیے آ کے ستاتے ہو؟
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی، تم جال میں ان کو پھنساتے ہو؟
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے، اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے، تم لا کے وہی پہناتے ہو؟
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے، من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے، تم کس سے آنکھ ملاتے ہو؟
یوں ڈانٹ ڈپٹ کر جوگی نے جب ہم سے یہ ارشاد کیا
سر اس کے جھکا کے چرنوں پر جوگی کو ہم نے جواب دیا

☆☆☆

ہیں ہم پردیسی سیلانی، یوں آنکھ نہ ہم سے چرا جوگی!
ہم آئے ہیں تیرے درشن کو، چتون پر میل نہ لا جوگی!
آبادی سے منہ پھیرا کیوں؟ جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں؟
ہر محفل میں ہر منزل میں، ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی!
کیا مسجد میں کیا مندر میں، سب جلوہ ہے "وجہ اللہ" کا
پربت میں، نگر میں، ساگر میں، ہر اترا ہے ہر جا جوگی!
پھر جوگی جی بیدار ہوئے، اس چھیڑ نے اتنا کام کیا
پھر عشق کے اس متوالے نے، یہ وحدت کا اک جام دیا

☆☆☆

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا!
جو آگ بجھائی جتنوں سے، پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا!
ہے شہروں میں غل شور بہت اور کام کرودھ کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت، سادھوؤں کی ہے بن میں جا بابا!
ہے شہر میں شورشِ نفسانی، جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی، بن وحدت کا دریا بابا!
دھن دولت آنی جانی ہے، یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے، باقی ہے ذاتِ خدا بابا

☆☆☆

مشق

1- نظم "جوگی" کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- نظم "جوگی" کا شاعر کون ہے؟
ا۔ اسمٰعیل میرٹھی　　ب۔ حالیؔ
ج۔ اقبالؔ　　د۔ خوشی محمد ناظرؔ

ii- خوشی محمد ناظر کی وجہِ شہرت کیا ہے؟
ا۔ سیاست　　ب۔ وزارت
ج۔ شاعری　　د۔ تجارت

iii- شاعری میں خوشی محمد نے کس صنف میں لکھا؟

ا۔ غزل ب۔ نظم

ج۔ مثنوی د۔ مرثیہ

iv- ''ہم پردیسی سیلانی'' سے کیا مراد ہے؟

ا۔ عوام ب۔ جوگی

ج۔ شاعر د۔ شاعر اور جوگی

2- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں۔

i- جوگی شہروں کو چھوڑ کر پہاڑ پر کیوں رہتا تھا؟

ii- شاعر نے جوگی کو شہر میں آ کر بسنے کے لیے کیا دلائل دیے؟

iii- جوگی نے شاعر کے دلائل کے جواب میں کیا کہا؟

3- نظم ''جوگی'' میں صبح کے منظر کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

4- نظم ''جوگی'' کے مطالعے سے جوگی کا جو حلیہ آپ کے سامنے آتا ہے' اُسے مختصراً اپنے الفاظ میں لکھیں۔

5- نظم ''جوگی'' کے آخری چار اشعار کا مطلب لکھیں۔

6- نظم ''جوگی'' کا مرکزی خیال لکھیں۔

7- خوشی محمد ناظر کے بارے میں سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

8- درج ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

مطلعِ تاباں۔ بقعۂ نور۔ ادائے گلبن۔ شورشِ نفسانی۔ جلوۂ روحانی۔

9- i- کمرہ آئینے کی طرح صاف ہے۔

ii- بادشاہ حاتم کی طرح سخی تھا۔

iii- اکبر شیر کی طرح بہادر ہے۔

ان جملوں میں کمرے کو آئینے کی مانند، بادشاہ کو حاتم کی مانند اور اکبر کو شیر کی مانند کہا گیا ہے۔ کیونکہ کمرے اور آئینے میں مشترک صفت ''صفائی''، بادشاہ اور حاتم میں مشترک صفت ''سخاوت'' اور اکبر اور شیر میں مشترک صفت ''بہادری'' ہے۔

کسی ایک شے کو کسی مشترک صفت کی بنا پر کسی دوسری شے کی مانند قرار دینا جب کہ وہ صفت دوسری چیز میں زیادہ نمایاں اور مشہور ہو تشبیہ کہلاتا ہے۔ آپ تشبیہ کی مزید تین مثالیں درج کریں۔

☆☆......☆☆......☆☆

جوش ملیح آبادی

سالِ ولادت: ۱۸۹۶ء　　　　سالِ وفات: ۱۹۸۲ء

اصل نام شبیر حسن خاں اور جوشؔ تخلص تھا۔ وہ ۱۸۹۶ء میں ملیح آباد (نواحِ لکھنؤ) میں پیدا ہوئے اور اس نسبت سے ملیح آبادی کہلائے۔ جوشؔ کے والد کا نام بشیر احمد خان بشیر تھا۔ جوش کے والد، دادا نواب محمد احمد خاں اور پردادا فقیر محمد خاں گویاؔ بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ یوں شعر و شاعری ان کا خاندانی فن تھا۔

جوش نے دستورِ زمانہ کے موافق عربی اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی مگر مالی حالات کی ناسازگاری اور لاابالی طبیعت کی بنا پر اپنی تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ آغاز میں جوش کا تعلق آسودہ گھرانے سے تھا مگر بعد ازاں وراثت کی نسل در نسل منتقلی کے بعد ان کے مالی حالات خراب ہوتے چلے گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جوشؔ یہاں آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی جہاں انھیں بہت عزت اور پذیرائی ملی۔ جوشؔ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" کے نام سے رقم کی جسے بہت سراہا گیا۔

جوشؔ کا نام نظم نگاری کے میدان میں بڑا اہم اور نمایاں ہے۔ وہ ایک عظیم نظم گو شاعر تھے۔ جوش کا تعلق جدید شاعری سے ہے۔ وہ ایک بلند آہنگ شاعر تھے۔ تحریکِ آزادی کے زمانے میں جوش نے اپنی شاعری کے ذریعے اس تحریک میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پُر جوش اور انقلابی نظمیں لکھنے کے باعث آپ "شاعرِ انقلاب" کہلائے۔

جوشؔ کو "شاعرِ فطرت" اور "شاعرِ شباب" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جوش کی نظموں میں مناظرِ فطرت کی عمدہ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ شباب کی ولولہ انگیزی بھی پائی جاتی ہے۔

جوشؔ کے کلام میں غضب کا جوش و خروش، جذبات و تخیلات کی شدت اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ جوش کو قدرتِ بیان کی نمایاں خوبی حاصل تھی۔ ان کے پاس بے پناہ ذخیرۂ الفاظ تھا۔ جوش کے خاص موضوعات میں انقلاب، سیاست، آزادی کی تڑپ، انسان دوستی اور خمریات شامل ہیں۔

محاکات نگاری، جذبات نگاری، فطرت کی عمدہ تصویر کشی، تشبیہات و استعارات کی جدت و ندرت اور قدرتِ زبان و بیان جوش کی شاعری کے امتیازی اوصاف ہیں۔

جوش کے اہم شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں:۔

شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، جذباتِ فطرت، عرش و فرش، رامش و رنگ، سرود و خروش، سموم و صبا اور شاعر کی راتیں۔

مناظرِ سحر

کیا روح فزا جلوۂ رخسار سحر ہے کشمیر دلِ زار ہے فردوسِ نظر ہے
ہر پھول کا چہرہ عرقِ حسن سے تر ہے ہر چیز میں اک بات ہے ہر شے میں اثر ہے
ہر سمت بھڑکتا ہے رُخِ حور کا شعلہ
ہر ذرّۂ ناچیز میں ہے طور کا شعلہ

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذرّوں کا تبسم چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جن پہ ترنُّم
گردوں پہ سپیدی و سیاہی کا تصادُم طوفان وہ جلووں کا وہ نغموں کا تلاطُم
اڑتے ہوئے گیسو وہ نسیمِ سحری کے
شانوں پہ پریشان ہیں یا بال پری کے

خنکی وہ بیاباں کی وہ رنگینیٔ صحرا وہ وادیٔ سر سبز وہ تالابِ مصفّا
پیشانیٔ گردوں پہ وہ ہنستا ہوا تارا وہ راستے جنگل کے وہ بہتا ہوا دریا
ہر سمت گلستاں میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رخسار گلوں کے

وہ روح میں انوارِ خدا صبح وہ صادق وہ حسن جسے دیکھ کے ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق زرّیں وہ افق نور سے لبریز وہ مشرق
وہ نغمۂ داؤد پرندوں کی صدا میں
پیراہنِ یوسف کی وہ تاثیر ہوا میں

☆☆☆

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- شاعر نے حمد میں ڈوبی ہوئی آواز کسے کہا ہے؟

ii- شاعر نے پرندوں کی صدا کو کس سے تشبیہ دی ہے؟

iii- شاعر کو ہر ذرّۂ ناچیز میں کس کا شعلہ دکھائی دیا؟

iv- گلستان میں ہر سمت کس چیز کے انبار لگے ہیں؟

2- نظم ''مناظرِ سحر'' کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ''مناظرِ سحر'' کا شاعر کون ہے؟

ا۔ اقبالؒ ب۔ حالی ج۔ جوشؔ د۔ حفیظ جالندھری

ii- جوشؔ کی پسندیدہ صنفِ سخن کون سی ہے؟

ا۔ غزل ب۔ نظم ج۔ قصیدہ د۔ مثنوی

iii- جوشؔ کی شاعری کا غالب رنگ کیا ہے؟

ا۔ مزاحیہ ب۔ طنزیہ ج۔ اصلاحی د۔ انقلابی

iv- ''مناظرِ سحر'' کے صرف ایک بند میں ردیف موجود ہے۔ وہ کون سا بند ہے؟

ا۔ پہلا ب۔ دوسرا ج۔ تیسرا د۔ چوتھا

3- ''مناظرِ سحَر'' میں شاعر نے جو منظر پیش کیے ہیں انھیں اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

4- جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیں۔

5- ''مناظرِ سحر'' کا تعلق نظم کی کس صنف سے ہے؟ اسی صنف سے تعلق رکھنے والی کسی ایک اور نظم کا حوالہ دیں۔

6- نظم کے چوتھے بند کی تشریح کریں۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

سمت۔ ذرّۂ ناچیز۔ نسیمِ سحری۔ خنکی۔ صادق۔

استعارہ:

i- ماں نے کہا ''میرا چاند آیا ہے۔''

ii- ہمارے شیروں نے دشمن کو شکست دے دی۔

ان جملوں میں ''چاند'' سے مراد بیٹا ہے اور ''شیروں'' سے مراد بہادر سپاہی ہے۔

جب کوئی لفظ اپنے اصل معنی کی بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال ہو کہ اس کے اصلی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق پایا جائے تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

حفیظ جالندھری

سالِ ولادت: ۱۹۰۰ء　　　　　　　　　　　　سالِ وفات: ۱۹۸۲ء

حفیظ جالندھری جالندھر کے محنت کش گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام محمد حفیظ اور والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی۔ نامساعد حالات کے باعث وہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ انھوں نے اُردو ادب میں جو بھی مقام حاصل کیا وہ ان کے فطری ذوق، ذاتی قابلیت، فنِ شاعری پر بھرپور توجہ اور مسلسل محنت کا مرہونِ منت ہے۔ ان کا شعری ذوق تو فطری تھا مگر فارسی شعر و ادب کے نامور استاد مولانا ''گرامی'' جیسی فاضل شخصیت کی رہنمائی نے ان کے فن کو جلا بخشی اور انھوں نے ادبی دنیا میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

۱۹۲۲ء میں انہوں نے مولانا گرامی کی نگرانی میں رسالہ ''اعجاز'' کا اجرا کیا۔ اس کے بعد لاہور آ کر ''ہونہار بک ڈپو'' قائم کیا اور ادبی رسائل و کتب کی ادارت و اشاعت کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں حکومت برطانیہ نے انھیں آل انڈیا ریڈیو (دہلی) میں ''سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن'' کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور میں مستقلاً رہائش پذیر ہوئے۔ وہ کئی سال تک شعبۂ نشر و اشاعت سے منسلک رہے اور مختلف رسائل کی ادارت بھی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر و سخن کی طرف بھی بھرپور توجہ دی اور اُردو شاعری میں ''شاہنامۂ اسلام'' جیسے گراں قدر اضافے کیے۔ بھرپور زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔

حفیظ جالندھری کو قدرت کی طرف سے شاعرانہ مزاج ودیعت ہوا تھا۔ اس لیے وہ بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔ مولانا گرامی کی شاگردی نے اس فطری ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگے۔ جلد ہی ان کی شاعری کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی۔

انھوں نے فردوسی کے ''شاہنامہ'' کے انداز میں اُردو میں ''شاہنامۂ اسلام'' لکھا۔ بلاشبہ یہ حفیظ کا ایک اہم کارنامہ اور اُردو شاعری میں گراں قدر اضافہ ہے۔ حفیظ جالندھری کو زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری کی زبان سادہ، صاف، رواں اور مخصوص دلکشی کی حامل ہے۔ انھوں نے نرم اور شیریں الفاظ کا انتخاب کیا۔ اس لیے ان کے کلام میں موسیقیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ وہ ارادی طور پر بھی الفاظ کی ترتیب میں موسیقی کا لحاظ رکھتے اور مترنم بحروں کا انتخاب کرتے تھے۔ انھوں نے حسن و موسیقی کے امتزاج سے نئی نئی راہیں نکالیں۔ چھوٹی اور مترنم بحروں، ہندی الفاظ، فارسی تراکیب، تکرارِ الفاظ اور بول چال کے فطری انداز نے ان کی شاعری میں ایسا حسن اور تاثر پیدا کیا کہ قاری اس سے بجا طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔

حفیظ جالندھری قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خوبیاں سوز و گداز، دلکشی اور اثر آفرینی ہے۔ موضوعات، خیالات، منظر کشی اور تشبیہات و تلمیحات کے اعتبار سے ان کا کلام انفرادیت کا حامل نظر آتا ہے۔ منظر کشی کے معاملے میں وہ مانی و بہزاد کے مقابل نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں اگر ایرانی باغوں اور مرغزاروں کا ذکر ملتا ہے تو حفیظ کے ہاں بسنت بہار کی آمد کا پیغام لاتی ہے۔

حفیظ کے کلام میں مقامی رنگ بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے اردگرد کے ماحول، موسموں اور دیس کی بولیوں اور فضاؤں کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ حفیظ نے گیت نگاری میں بھی مہارت دکھائی اور ہندی کی نرم و شیریں بحروں میں ہلکے پھلکے گیت لکھے جو موسیقیت کے اعتبار سے بھی عمدہ فن پارے ہیں۔

غرضیکہ حفیظ نئی طرز کے مترنم گیتوں، شاعری کے متنوع موضوعات کے اعتبار سے اہم اور منفرد شاعر ہیں۔ ''تلخابۂ شیریں''، ''شاہنامۂ اسلام''، ''سوز و ساز''، ''حفیظ کے گیت''، ''حفیظ کی نظمیں'' اور ''چیونٹی نامہ'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ حفیظ جالندھری نے ہمارے وطن پاکستان کا قومی ترانہ بھی لکھا۔

نظم ''درّۂ خیبر'' ان کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے اور تمام فکری و فنی خوبیوں کی حامل ہے۔

درّہ خیبر

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا تھرّا کے چلتی ہے
یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار لافانی پرانی داستانوں کے
یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں
یہ ذرّے رہرووں کی ہمتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں
یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں
لیے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دنیا بھر کے ہنگامے
یہ بے آباد دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ
انھی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گزرا
زمینِ ہند پر جاتا ہوا اک آسماں گزرا
اسی رستے سے ہوکر ہُنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے، کئی آباد کار آئے
یہ مٹی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک
اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
انھی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں
فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا

اُڑی یہ خاک برسوں تک غبار کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دھواں ہو کر
اسے تیمور نے روندا اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا
یہاں سے بارہا گزرے اٹالے بارگاہوں کے
قدم چومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے
کہاں اب وہ شکوہ نادری، اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی
یہ ہے وہ خار زار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- درۂ خیبر سے کن کا کارواں گزرا؟
ii- درۂ خیبر سے جو عظیم فاتح گزرا اس کا نام بتائیں؟
iii- وہ کون سا بادشاہ تھا جو بارہا درۂ خیبر سے گزر کر ہندوستان آیا؟
iv- درۂ خیبر سے جو پہلا مغل بادشاہ گزرا اس کا نام بتائیں؟

2- نظم ''درۂ خیبر'' کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ''درۂ خیبر'' کا شاعر کون ہے؟
ا۔ حفیظ ہوشیار پوری ب۔ حفیظ جالندھری ج۔ حفیظ جون پوری د۔ حفیظ تائب

ii- حفیظ جالندھری کی وجہِ شہرت کیا ہے؟
ا۔ صحافت ب۔ ادارت ج۔ سیاست د۔ شاعری

iii- جنگِ عظیم کے دنوں میں انھوں نے زیادہ تر کس صنف میں لکھا؟
ا۔ غزل ب۔ نظم ج۔ گیت د۔ مثنوی

iv- ساری نظم میں ردیف کیا ہے؟
ا۔ ہیں ب۔ ہے ج۔ کے د۔ کوئی بھی ردیف نہیں

3- ''درۂ خیبر'' کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کریں۔

4- نظم ''درۂ خیبر'' کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کریں۔

5- حفیظ جالندھری پر ایک مختصر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- خالی جگہ پُر کریں۔

i- نہ اس میں ....اُگتی ہے نہ..........کھلتے ہیں
ii- زبانِ حال سے..........کے..........سناتے ہیں
iii- اڑی یہ..........برسوں تک غبار کارواں ہو کر
iv- اسی تابش میں چمکی تھیں..........کی شمشیریں

7- درۂ خیبر کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟

ن۔م۔راشد

سالِ ولادت:۱۹۱۰ء　　　　سالِ وفات:۱۹۷۵ء

''نذر محمد راشد'' گوجرانوالہ کے قصبہ اکال گڑھ (جسے آج کل علی پور چٹھہ کہتے ہیں) میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ان کا اصلی نام نذر محمد اور قلمی نام ن۔م۔راشد ہے۔ان کے دادا راجا غلام رسول چشتی طبیب، عالم اور شاعر تھے۔شاعری میں ان کا تخلص ''غلامی'' تھا۔ن۔م راشد کے والد راجا فضل الٰہی چشتی بھی شعری ذوق کے مالک تھے اور گاہے بہ گاہے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔انھیں فارسی شاعری کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔راشد نے حافظ، سعدی، غالب کی شاعری سے انھی بزرگوں کی بدولت آشنائی حاصل کی۔

۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اسی سال اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لائل پور (جواب ''فیصل آباد'' کہلاتا ہے) میں داخلہ لے لیا۔۱۹۲۸ء میں یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۳۰ء میں بی۔اے اور ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے اقتصادیات کے امتحان پاس کیے۔دورانِ تعلیم وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی مجلّہ ''راوی'' کے حصۂ اُردو کے ایڈیٹر رہے۔اس دوران ''راوی'' میں راشد کی نظمیں اور مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔وہ کالج کی ''بزمِ سخن'' کے سیکرٹری بھی رہے اور مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں شرکت کرتے رہے۔

۱۹۳۴ء میں اُنھوں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کے رسالہ ''شہکار'' کی ادارت کی۔انھوں نے عملی زندگی کا آغاز ملتان کے کمشنر آفس میں ایک معمولی ملازمت سے کیا۔اسی زمانے میں انھوں نے پہلی آزاد نظم ''جرأت پرواز'' لکھی۔ان کی سب سے زیادہ حیران کر دینے والی نظم ''اتفاقات'' تھی جو ۱۹۳۵ء میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئی۔قیامِ ملتان کے دوران میں وہ ایک سال تک خاکسار تحریک سے بطور ''ضلع سالار'' وابستہ رہے۔

۱۹۳۹ء میں راشد کو بطور نیوز ایڈیٹر آل انڈیا ریڈیو میں اچھی ملازمت مل گئی۔۱۹۴۳ء میں انھیں فوج میں عارضی کمیشن ملا اور مختلف ممالک میں بطور ''پبلک ریلیشنز آفیسر'' خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔

۱۹۴۸ء میں وہ پھر سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر ریجنل ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔۱۹۵۲ء میں انھوں نے اقوامِ متحدہ کی ملازمت اختیار کر لی اور مختلف ممالک میں بطور ڈائریکٹر اطلاعات کام کیا۔۱۹۷۳ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۹۔اکتوبر ۱۹۷۵ء کو انتقال کر گئے۔

راشد کو بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر رہا۔اس لیے وہ شروع ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس شوق میں اضافہ ہوتا گیا۔وہ پوری توجہ سے لکھنے کی طرف راغب رہے جس کے نتیجہ میں وہ زمانہ طالب علمی ہی سے بطور شاعر معروف ہو گئے۔انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل اور پابند نظم سے کیا جو بھرپور رومانوی رجحانات کی حامل تھی۔جدید مغربی شعرا کے زیرِ اثر انھوں نے نظم نگاری کی طرف بھی توجہ دی اور آزاد نظم کی طرف خصوصی طور پر توجہ مبذول کی۔یوں راشد نے روایت سے انحراف بھی کیا اور انحراف کو روایت سے ملائے بھی رکھا۔

راشد کی نظموں میں تخیل کی جدّت طرازی کے ساتھ ساتھ افسانوی اور ڈرامائی عناصر بھی نمایاں ہیں۔ان کی نظموں میں شاعر کے واحد متکلم ہونے کے بجائے ایک یا ایک سے زیادہ کردار ملتے ہیں اور موقع کی مناسبت سے کہیں خود کلامی اور کہیں مکالمے کا انداز نظر آتا ہے۔گویا روایتی نظم نگاری کے برعکس آزاد نظم میں ایک منطقی انداز کے برعکس ایک متحرک تصورِ زمان و مکاں ملتا ہے۔راشد کی شاعری کا مرکز و محور آفاقی انسان ہے جو اقدار کی شکست و ریخت میں اپنے وجود کے معنی و مفہوم کھو بیٹھا ہے۔راشد اسے اس کے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔

راشد کی تصانیف ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی''، ''لا=انسان'' اور ''گمان کا ممکن'' ہیں۔نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو'' ان کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔

زندگی سے ڈرتے ہو؟

............زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے،
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہنگ سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!
''ان کہی'' سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اُس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!
............پہلے بھی تو گزرے ہیں،
دورِ نارسائی کے، ''بے ریا'' خُدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہِ خداوندی!
تم مگر یہ کیا جانو،
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اُٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اُٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اُٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں،

روشنی سے ڈرتے ہو!

......شہر کی فصیلوں پر

دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر

رات کا لبادہ بھی

چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر

اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی

ذات کی صدا آئی

راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے

اک نیا جنوں لپکے!

آدمی چھلک اُٹھے

آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو

تم ابھی سے ڈرتے ہو؟

☆☆☆

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

ii- ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' میں ''آدمی سے ڈرتے ہو؟'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

iii- حرف اور معانی کے رشتہ سے شاعر کیا بات سمجھانا چاہتا ہے؟

iv- نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' نظم کی کون سی صنف ہے؟

2- نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ''زندگی سے ڈرتے ہو'' کا شاعر کون ہے؟

ا۔ خوشی محمد ناظر ب۔ حالی ج۔ فیض احمد فیض د۔ ن۔م۔راشد

ii- یہ نظم کس صنف سے تعلق رکھتی ہے؟

ا۔ پابند نظم ب۔ نثری نظم ج۔ آزاد نظم د۔ معریٰ نظم

iii- ن۔م۔راشد کہاں پیدا ہوئے؟

ا۔ لاہور میں ب۔ گوجرانوالا میں ج۔سیالکوٹ میں د۔ فیصل آباد میں

iv- ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کہاں آباد ہوئے؟

ا۔ لندن میں ب۔ پیرس میں ج۔ نیویارک میں د۔ گوجرانوالہ میں

3- ن۔م۔راشد پر ایک مختصر سوانحی تنقیدی نوٹ لکھیں۔

4- ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

5- ''زندگی سے ڈرتے ہو؟'' کا فکری و فنی جائزہ لیں۔

6- مندرجہ ذیل مصرعوں کی وضاحت کریں:۔

i- آدمی زباں بھی ہے آدمی بیاں بھی ہے ii- جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو

iii- ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں راہ کا نشاں بن کر iv- روشنی تو تم بھی ہو روشنی تو ہم بھی ہیں

7- خالی جگہ پر کریں۔

i- آدمی زبان بھی ہے آدمی..........بھی ہے ii- لب اگر نہیں ہلتے..........جاگ اٹھتے ہیں

iii- ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی..........بن کر iv- ذات کی..........آئی

☆☆.....☆☆.....☆☆

فیض احمد فیض

سالِ ولادت: ۱۹۱۱ء سالِ وفات: ۱۹۸۵ء

فیض احمد فیض سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری سلطان محمد خاں بار ایٹ لا سیالکوٹ کے وکیل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین تھے۔ فیض نے عربی، فارسی، اُردو، حفظِ قرآن اور مذہبی تعلیم مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب سے حاصل کی۔

۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ مرے کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ یہاں سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور بعد میں اورینٹل کالج سے عربی میں ایم۔اے کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد فیض نے (۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۰ء) ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ آپ نے (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء) معروف ادبی مجلّے "ادبِ لطیف" کی ادارت بھی کی۔ اس کے بعد (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء) ہیلی کالج میں انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ اسی دوران میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "نقشِ فریادی" شائع ہوا۔ اسی دور میں فیض نے ایک انگریز خاتون "ایلس جارج" سے شادی کی جنھوں نے قدم قدم پر فیض کا ساتھ دیا۔

جنگِ عظیم دوم کے دوران میں (جون ۱۹۴۲ء) فیض فوج میں ملازم ہوئے اور پانچ سال کے بعد استعفا دے کر لاہور آ گئے۔ آپ روزنامہ "امروز"، "پاکستان ٹائمز" اور "لیل و نہار" کے مدیر بھی رہے۔

۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء امورِ ثقافت و وزارت تعلیم پاکستان کے مشیر رہے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء تک یاسر عرفات کی زیرِ نگرانی بیروت سے شائع ہونے والے ایفرو ایشیائی سہ ماہی مجلّے "لوٹس" کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ نومبر ۱۹۸۱ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ فیض نے جہاں اور جس عہدے پر بھی ملازمت کی، شعر و شاعری کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رکھا۔

آپ کی تصانیف میں "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا"، "دست تہِ سنگ"، "سرِ وادیٔ سینا"، "مرے دل مرے مسافر"، "شامِ شہرِ یاراں" اور "غبارِ ایام" شامل ہیں جو ان کی وفات کے بعد "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے یکجا شایع ہوئیں۔

فیض دبستانِ لاہور کے ان اُردو شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے زندگی کے حسن و جمال اور نشیب و فراز کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ فیض نے شاعری کی مثبت روایات اور ثقافتی ورثے کو قائم رکھا۔ فیض نے ہر جگہ نہایت شستہ اور پاکیزہ زبان استعمال کی ہے۔ فیض نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھی ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔

فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے پرانی علامتوں کو نئے نئے معنی دیے اور فکر و خیال سے سیدھے سادے الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا کہ ان میں نئی معنویت پیدا کر دی یعنی انھوں نے نہ صرف قدیم اُردو شاعری کی روایات سے فائدہ اٹھایا بلکہ جدید شعری سرمائے سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ سوز و گداز فیض کی شاعری کا خاص پہلو ہے۔ اس میں سوز و گداز کی ایسی لہر ملتی ہے جو قاری یا سامع کو اداس کر دیتی ہے۔ کلامِ فیض میں اجتماعی غم کا پہلو ملتا ہے۔ ان کے ہاں تصورِ عشق بھی ملتا ہے مگر وہ عام روایتی عشق سے سراسر مختلف ہے۔ وہ عشق کو تکمیلِ ذات کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ کلامِ فیض میں نمایاں پہلو معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کی ترجمانی ہے۔

"اقبال"، فیض کی بہت خوبصورت نظم ہے جس میں علامہ اقبال کو ایک عظیم شخصیت قرار دیا گیا ہے۔

اِقبال

آیا ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سُنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مَے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذّت شناس ہیں

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیں۔

i- فیضؔ نے اقبالؒ کو ''خوش نوا فقیر'' کیوں کہا ہے؟

ii- ''ویراں کدوں'' سے فیض کی کیا مراد ہے؟

iii- ''شاہِ گدا نما'' کس کی طرف اشارہ ہے؟

iv- ''لذّت شناس'' سے کون لوگ مراد ہیں؟

2- نظم ''اقبال'' کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- نظم ''اقبال'' کا شاعر کون ہے؟

(ا) حفیظ جالندھری (ب) جوش
(ج) فیض احمد فیض (د) ن۔م راشد

ii- کون سی کتاب فیض کی ہے؟

(ا) گلبانگِ جہاد (ب) نقشِ فریادی
(ج) موجِ صبا (د) سوز و ساز

iii- فیض کی وجہ شہرت کیا ہے؟

(ا) سیاست (ب) ادارت

(ج) صحافت (د) شاعری

iv- فیض کس کالج کے پرنسپل رہے؟

(ا) ایم اے او کالج امرتسر کے (ب) گورنمنٹ کالج لاہور کے

(ج) عبداللہ ہارون کالج کراچی کے (د) کسی کالج کے نہیں

3- فیض کی نظم ''اقبال'' کا خلاصہ لکھیں۔

4- ''دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں'' اس مصرے کی وضاحت کریں۔

5- فیض احمد فیض پر ایک مختصر سوانحی نوٹ لکھیں۔

6- مصرے مکمل کریں۔

i- آیا ہمارے............ میں اک خوش نوا فقیر

ii- اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ............ نما

iii- سنسان راہیں خلق سے............ ہو گئیں

iv- آیا اور اپنی دھن میں............ خواں گزر گیا

7- مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

خوش نوا فقیر، شاہِ گدا نما، ادائے خاص، لذت شناس

☆☆......☆☆......☆☆

مجید امجد

سالِ ولادت: ۱۹۱۴ء　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　سالِ وفات: ۱۹۷۴ء

مجید امجد جھنگ میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام عبدالمجید تھا۔ والد کا نام علی محمد تھا جو محکمہ تعلیم سے منسلک تھے۔ وہ چھے ماہ کی عمر میں ماں کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ان کی عمر تین سال کی تھی کہ والد نے دوسری شادی کر لی۔ گھریلو حالات ناساز گار ہو گئے تو نانا میاں نور محمد اپنی بیٹی کی نشانی کو اپنے ساتھ لے گئے اور ان کی پرورش کی ساری ذمہ داری اپنے ذمے لے لی۔ ان کے نانا اپنے وقت کے عالم، فقیہ، محدث اور ماہر طبیب تھے۔ لہٰذا انھوں نے دینی تعلیم کے علاوہ ابتدائی تعلیم بھی انھی سے حاصل کی۔ مجید امجد نے عربی اور فارسی کی تعلیم بھی اپنے نانا ہی سے حاصل کی۔

مجید امجد بھی اپنے نانا کی طرح بہت ذہین تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ صرف پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید، گلستان، بوستان، پند نامہ عطا وغیرہ پڑھ چکے تھے۔ اسلامیہ ہائی سکول جھنگ سے ۱۹۳۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے ایف اے پاس کیا اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے پاس کیا۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد مجید امجد جھنگ ہی میں محکمہ "دیہات سدھار" میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں ہفت روزہ "عروج" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں "عروج" سے الگ ہو کر ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں محکمہ خوراک میں ملازم ہو گئے۔ دورانِ ملازمت زیادہ تر ساہیوال رہے اور یہیں سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اس دوران میں مقامی طور پر ان کی شخصیت شعری و ادبی ماحول کا محور بنی رہی۔ ۱۱ رمئی ۱۹۷۴ء کو ساہیوال میں ان کا انتقال ہوا اور ان کے آبائی شہر جھنگ میں دفن کیا گیا۔

مجید امجد کی ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہو گیا تھا لیکن ان کو شہرت ان کی وفات کے بعد ملی۔ انھوں نے ساری زندگی دکھ اٹھائے۔ پہلے ماں باپ کی جدائی، پھر ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اولاد سے محرومی، ان سب باتوں نے مل کر مجید امجد کی زندگی کو تلخ بنا دیا تھا مگر انھوں نے کبھی کسی پر اپنے دکھوں کا اظہار نہیں کیا بلکہ خود کو شاعری کی دنیا میں گم کر لیا۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر یا "بزم فکر و ادب" کی لائبریری تک خود کو محدود رکھا۔

مجید امجد دبستانِ لاہور کے وہ شاعر ہیں جن کے ہاں موضوعات، اسالیب اور ہیئتوں کا حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے ہیئت کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر نظم ایک الگ ہیئت کی حامل ہے۔

مجید امجد کی شاعری غم کی ترجمان ہے۔ وہ کبھی کبھی مسکراتے بھی ہیں لیکن اس کے اندر بھی درد کی کسک صاف محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظم "پچاسویں پت جھڑ" اس کی واضح مثال ہے۔ مجید امجد کو مظاہر فطرت سے گہرا لگاؤ ہے لیکن اس کے لیے وہ حسین نظاروں کی مرقع نگاری کرنے کی بجائے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں یعنی کھیت کھلیان، فصلیں، ندی، نالے، راجباہ، نہریں اور اسی طرح دوسری چیزیں ان کی شاعری کا محور ہیں۔ وہ انھی مناظر سے شاعرانہ تخیل کی ایسی مسحور کن فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔

مجید امجد جدید شاعری کے اہم ترین نمائندوں میں سے تھے۔ انھوں نے نئی نظم کو نئی علامات دیں، نئے استعاروں سے روشناس کرایا اور نئی نظم کی طرح نئی غزل کو جدت کا حامل بنایا۔ مجید امجد کی زندگی دُکھ اور کرب سے عبارت رہی۔ اسی لیے ان کے ہاں خود کلامی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ان کا مندرجہ ذیل مشہور شعر ان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے:

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

بے تحاشا دُکھ انسان کو قنوطیت پسند بنا دیتے ہیں مگر مجید امجد قنوطیت پسند نہ تھے۔ تاہم ان کی شاعری میں غالب رنگ حزنیہ ہے۔ مجید امجد ایک حساس انسان تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں معاشرتی مسائل پیش کر کے اپنے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

نظم "طلوعِ فرض" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں صبح کے وقت انسان حیوان، چرند پرند، امیر غریب، افسر ملازم اور بھکاری سب اپنے اپنے طور پر تلاشِ معاش کے لیے نکل پڑتے ہیں کیونکہ یہی زندگی ہے۔ زندگی کو گزارنے کے لیے محنت ضروری ہے۔

طلوعِ فرض

سَحَر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

....

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
امیدوں کے سنہرے جال بُن کے اڑا جاتا ہے چگنے دانے دنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے
ہے ہر اک کو بچشمِ تر گزرنا مجھے چل کر اُسے اڑ کر گزرنا

....

وہ اک اندھی بھکارن لڑکھڑائی
کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے صدا سے راہگیروں کو جکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا' میلا میلا دامن
یہ کاسہ' یہ گلوئے شور انگیز مرا دفتر' مری مسلیں' مرا میز

....

چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی' جاگا اٹھا اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیا پے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی افتادگی بھی متاعِ زیست اس کی بھی' مری بھی

....

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس شرابوں سا نشیلا کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو پینا مگر مقصد وہی دو سانس جینا

....

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیں:

i- مجید امجد نے اپنی نظم کا عنوان ''طلوعِ فرض'' کیوں رکھا ہے؟

ii- شاعر صبح کے وقت اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے کہاں اور کس کے ہمراہ جا رہا ہے؟

iii- شاعر کو اپنے اور پرندے اور اندھی بھکارن میں کیا مماثلت نظر آئی؟

2- سوالات کے درست جوابات کے گرد دائرہ لگائیں:

i- ''طلوعِ فرض'' کے شاعر کا نام کیا ہے؟

ا۔ فیض احمد فیض ب۔ ن۔م۔راشد

ج۔ جوش د۔ مجید امجد

ii- مجید امجد کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

ا۔ سرکاری ملازمت ب۔ وسیع مطالعہ

ج۔ ادارت د۔ شاعری

iii- مجید امجد نے کس صنفِ شاعری کو خاص طور پر اپنایا؟

ا۔ غزل کو ب۔ نظم کو

ج۔ مرثیہ کو د۔ مثنوی کو

iv- مجید امجد کی شاعری کا مجموعی رنگ کیا ہے؟

ا۔ مزاحیہ ب۔ طنزیہ

ج۔ حزنیہ د۔ طربیہ

3- مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

بچشمِ تر۔ گلوئے شورانگیز۔ غبارِ رہ۔ متاعِ زیست۔ ہمرہِ صد کارواں۔

4- مصرعے مکمل کریں۔

i- کوئی خاموش پنچھی..........................

ii- وہ اک اندھی بھکارن..........................

iii- چمکتی کار..........................

iv- گلستان میں کہیں..........................

v- مگر مقصد وہی..........................

5- مجید امجد پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیے۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

قطعہ۔رباعی

قطعہ:

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں یہ ایک ایسی صنف شعر ہے جس میں قافیوں کی ترتیب قصیدے یا غزل کے مطابق ہوتی ہے یعنی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن غزل اور قصیدے کے برعکس قطعے میں بالعموم مطلع نہیں ہوتا اور مقطع بھی ضروری نہیں۔

اردو میں قطعہ نگاری کا آغاز دکن کی سرزمین سے عمل میں آیا۔ شمالی ہند میں حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، اور انشاؔ وغیرہ نے اس صنف کو مزید ترقی دی۔ان کے بعد غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ نے بھی اس صنف سے بہت کام لیا۔حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، ظفر علی خان، جوشؔ، احسان دانشؔ فیضؔ، اخترؔ انصاری، احمد ندیم قاسمیؔ اور عارف عبدالمتین کے قطعات کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

رباعی:

رباعی عربی زبان کے لفظ ''رُبع'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''چار'' ہے۔اصطلاح میں رباعی اس مختصر نظم کو کہا جاتا ہے جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع لازماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔تیسرے مصرعے میں قافیہ ضروری نہیں۔رباعی کے پہلے تین مصرعے تین سیڑھیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری کو بتدریج ایک ایسی بلندی تک لے جاتے ہیں جہاں چوتھا مصرع اپنا بھرپور جلوہ دکھاتا ہے۔اس چوتھے مصرعے کو تین مصرعوں کا نچوڑ، رباعی کی جان اور حاصلِ رباعی سمجھا جاتا ہے۔

رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے جس کی بحریں اور اوزان مخصوص ہونے کے علاوہ مشکل اور دقیق ہیں۔

اردو میں دکنی شاعر قلی قطب شاہ کو اردو رباعی میں اولیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔میرؔ، دردؔ، سوداؔ، انیسؔ، دبیرؔ، حالیؔ، اکبرؔ، جوشؔ، فراقؔ، گورکھ پوری اور عبدالعزیز خالد کی رباعیاں اہمیت رکھتی ہیں۔

رباعی کے موضوعات میں عشق ومحبت، اخلاق وتصوف، حمد ونعت، پند ونصیحت، بادہ وساغر، سیاست، معاشرت، محبوب کا سراپا اور مناظرِ فطرت وغیرہ شامل ہیں۔

اکبر الہ آبادی

سالِ ولادت:۱۸۴۶ء　　　　　　　　　　　　　　سالِ وفات:۱۹۲۱ء

سیّد اکبر حسین نام تھا اور تخلص بھی اکبر تھا۔ الہٰ آباد (بمقام بارٔہ) میں پیدا ہوئے۔ اکبر کے آباواجداد نیشاپور سے برصغیر آئے تھے۔ ان کے والد کا نام تفضل حسین رضوی تھا جن کا شمار صوفی بزرگوں میں ہوتا تھا۔ والدہ بھی نہایت دیندار خاتون تھیں۔ الغرض اکبر کا خاندان نہایت مذہبی اور تصوف سے خاص لگاؤ رکھنے والا تھا۔

اکبر کے گھریلو مالی حالات اچھے نہ ہونے کے سبب وہ باقاعدہ طور پر زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو سکے مگر اپنے طبعی ذوق اور ذاتی مطالعہ کی بدولت فارسی، عربی اور انگریزی بول چال کی خوب مہارت حاصل کر لی تھی۔ اکبر الہ آبادی ایسٹ انڈیا کمپنی میں سرکاری ملازم مقرر ہوئے پھر کچھ عرصہ بعد ہی مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ میں بطور ریڈر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ملازمت ترک کر کے وکالت کرنے لگے۔ ۱۸۸۰ء تک وکالت کا کام جاری رہا۔ جلد ہی اکبر منصف مقرر ہو گئے اور ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہو گئے، مگر آنکھوں کی تکلیف کی بنا پر ملازمت چھوڑنی پڑی۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۰۷ء میں عدالتی خدمات کے سلسلے میں حکومت نے اکبر کو ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں اکبر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اکبر کا شمار اپنے وقت کے نامور شعرا میں ہوتا تھا۔ اکبر کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے شغف تھا مگر ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز آتش کے شاگرد وحیدالدین وحید کی شاگردی میں آنے کے بعد ہوا۔ اکبر کی وجہ شہرت ان کا طنزیہ و ظریفانہ کلام ہے۔ اکبر ظرافت کے ذریعے اخلاقی، سیاسی، معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے نئی تہذیب کی کورانہ تقلید کو ہدفِ تنقید بنایا اور مغرب پسندی کی جھوٹی آن بان کا تمسخر اڑایا۔

یہ امر بجا طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اکبر کا کلام ہماری تاریخ اور اردو شاعری میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر ظرافت کے پردے میں بڑے بڑے نکتے کہہ جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر اکبر کی شاعری کی تہ میں گہرا فلسفہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

اکبر اپنے طنزیہ و ظریفانہ کلام، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات سے اصلاح و درستی کا کام لیتے ہیں اور مسلم قوم کو ایک نئی جہت دکھا کر تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ اردو قومی شاعری کے حوالے سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

احسان دانش

سالِ ولادت:۱۹۱۴ء　　　　　　　　　　سالِ وفات:۱۹۸۲ء

اصل نام احسان الحق اور تخلص احسان تھا۔ان کے والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔چنانچہ اسی نسبت سے احسان دانش کے نام سے مشہور ہوئے۔ احسان دانش ۱۹۱۴ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کاندھلہ میں ہی پائی مگر مالی تنگدستی اور غربت کے باعث باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہ کر سکے۔گھریلو مالی حالات ناساز گار ہونے کی بنا پر احسان کم عمری میں ہی تلاشِ روزگار میں لگ گئے۔محنت مزدوری کا کوئی ایسا کام نہ تھا جو احسان نے نہ کیا ہو۔معماری، باغبانی، قلی، مزدوری اور اس طرح کے دیگر پیشے اپناتے رہے مگر انھوں نے کبھی محنت مزدوری کو عار نہ سمجھا بلکہ ہمیشہ محنت کی عظمت کے عظیم مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔

احسان دانش محنت مزدوری کے سلسلے میں قیامِ پاکستان سے بہت پہلے لاہور آ گئے تھے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔احسان دانش کو کم سنی سے شعر وسخن سے لگاؤ تھا۔چنانچہ لاہور کی ادبی محافل میں ذوق وشوق سے شامل ہونے لگے اور جلد ہی ان کی شاعری کی شہرت پھیل گئی۔

احسان دانش کا شمار برصغیر کے نمایاں اور عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔وہ اردو کے نامور شاعر تھے۔احسان ایک فقیر منش، سادہ، خوش اخلاق اور علم دوست انسان تھے۔احسان دانش نے اپنی خود نوشت سوانح ''جہانِ دانش'' میں اپنے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھے ہیں۔بلاشبہ احسان دانش ایک عظیم شاعر تھے جنھوں نے اپنے گھریلو حالات ناساز گار ہونے کے باوجود کبھی ہمت نہ ہاری اور محنت کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے عمر بھر نہ صرف محنت مزدوری کی بلکہ ذاتی مطالعہ کر کے اپنی تعلیم کی کمی بھی بخوبی پوری کی اور اردو شاعری کے افق پر درخشندہ ستارہ بن کے ابھرے۔

۱۹۸۲ء میں یہ شاعرِ مزدور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

احسان دانش بنیادی طور پر شاعرِ انقلاب ہیں۔احسان کی شاعری کا موضوع زیادہ تر مفلوک الحال مزدور اور محنت کش طبقہ ہے۔احسان چونکہ خود بھی ایک مزدور تھے اس لیے محنت کش طبقہ کے دکھ درد کو بخوبی جانتے تھے۔علاوہ ازیں احسان دانش ایک اچھے نثر نگار تھے۔نثری خدمات کے حوالے سے ضرب الامثال اور تذکیر وتانیث پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا۔

مجموعی طور پر کلامِ احسان عزم، عمل، اخلاق، جدوجہد، اصلاحِ انسانیت سے بھرپور ہے۔

احسان دانش کی اہم تصانیف یہ ہیں:

نوائے کارگر، تفسیرِ فطرت، جادۂ نو، چراغاں، آتشِ خاموش، شیرازہ، گورستان، میراثِ مومن، زخم ومرہم۔

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی
ہر دل سے ، ہر گروہ سے ، ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ
یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے
(اکبرالہ آبادی)

☆☆☆

لاکھ ناداری ہو میں ہوں شاعرِ وحدت پرست
نقش جو بھی سامنے آیا وہی رد ہو گیا
جو سوا اس کے کسی کا دل میں گزرے گا خیال
میں اسے دانشؔ یہ سمجھوں گا کہ مرتد ہو گیا
(احسان دانشؔ)

☆☆☆

پھاوڑا کندھے پہ رکھے آ رہا ہے اک کسان
رنگ جس کے خون سے لیتے ہیں گلزاروں کے پھول
دل میں جینے کی تمنائیں فضا ناساز گار
آنکھ میں سرخی ، لبوں پر پپڑیاں، نتھنوں میں دھول
(احسان دانشؔ)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔
i- معاشرے میں انسان کی طاقت کا راز کیا ہے؟
ii- محبت کا تقاضا کیا ہے؟
iii- خاندانوں سے محبت اٹھ جانے کی وجہ کیا ہے؟
iv- احسان دانش نے اپنے مذہبی عقیدے کے بارے میں کیا بتایا ہے؟

-2 مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے جو درست ہیں ان کے گرد دائرہ لگائیں:

i- مندرجہ ذیل میں سے کون سا شعری مجموعہ احسان دانش کا ہے؟

ا۔ فصلِ گُل ب۔ فصلِ زیاں

ج۔ قفلِ سلاسل د۔ گلِ نغمہ

ii- اکبر الہ آبادی کا مجموعی رنگِ شاعری کیا ہے؟

ا۔ حُزنیہ ب۔ طربیہ

ج۔ فلسفیانہ د۔ مزاحیہ

iii- احسان دانش نے ابتدا میں کیا پیشہ اختیار کیا؟

ا۔ ملازمت ب۔ مزدوری

ج۔ صحافت د۔ ادارت

iv- اکبر الہ آبادی کا پیشہ کیا تھا؟

ا۔ ملازمت ب۔ تجارت

ج۔ صحافت د۔ ادارت

-3 احسان دانش نے قطعہ میں کسان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

-4 قطعہ اور رباعی کی تعریف کریں اور ہیئت کے اعتبار سے ان کا فرق واضح کریں۔

-5 اکبر الہ آبادی یا احسان دانش پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

-6 احسان دانش کو شاعرِ مزدور کیوں کہا جاتا ہے؟

☆☆......☆☆......☆☆

مولانا الطاف حسین حالؔی

سالِ ولادت: ۱۸۳۷ء   سالِ وفات: ۱۹۱۵ء

سوانحی حالات حصہ نثر میں ملاحظہ کریں۔

حالؔی جدید شاعری کے علمبردار تھے۔ حالؔی نے اپنے کلام کے ذریعے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور سیاسی و مذہبی بیداری کا درس دیا۔ اس کی عمدہ مثال حالؔی کی عالمگیر نظم ''مدّ و جزرِ اسلام'' ہے جو ''مسدس حالؔی'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی منظر کشی کرنے کے ساتھ ان میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کی عمدہ کاوش کی گئی ہے۔

حالؔی نے قدیم اور روایتی رنگ سے انحراف کرتے ہوئے تازگی بیان کی طرف توجہ دے کر قدیم شاعری میں اک نئی روح پھونک دی۔ حالؔی ''ادب برائے زندگی'' کے قائل تھے۔ حالؔی نے اپنی نظموں میں زندگی کے ہر گوشے بالخصوص سماجی و اخلاقی بے راہ روی اور عورتوں پر مظالم ڈھائے جانے کی نشاندہی کی ہے۔

یہ امر بجا طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ حالؔی نے نظم نگاری کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں اصلاحِ معاشرہ، سماجی بے راہ روی، مقصدیت اور احساسِ آزادی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ اندازِ بیان کی سادگی و صفائی، خلوص، جذبات کی صداقت، اخلاقیات، مبالغہ سے اجتناب کلامِ حالؔی کے نمایاں اوصاف ہیں۔ حالؔی کی مشہور نظموں میں ''برکھارت''، ''حبّ وطن''، ''مناظرۂ رحم وانصاف''، ''نشاطِ امید''، ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رباعیات

اے علم! کیا ہے تُو نے ملکوں کو نہال　　غائب ہوا تُو جہاں سے، واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح　　جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

....

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار　　دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سَو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا　　مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمّت دشوار

....

موسیٰؑ نے یہ کی عرض کہ اے بار خدا　　مقبول ترا کون ہے بندوں میں سِوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے　　جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

....

دنیائے دُنی کو نقشِ فانی سمجھو　　رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

(الطاف حسین حالؔی)

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا　　غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن　　کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

....

اونچا نیّت کا اپنی زینہ رکھنا　　احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصّہ آنا تو نیچرل ہے اکبر!　　لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

....

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا　　افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی　　جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

....

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں　　بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار　　مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

(اکبرالہ آبادی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- الطاف حسین حالؔی کی پہلی رباعی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟
ii- دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھنے سے حالؔی کی کیا مراد ہے؟
iii- اکبرالہ آبادی کی پہلی رباعی سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟
iv- رباعی کتنے مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے؟

2- مولانا حالؔی اور اکبرالہ آبادی کی دوسری رباعی کا مفہوم واضح کریں۔

3- مولانا حالؔی پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

4- مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کریں:

نقشِ فانی، افعالِ مضر، عمرِ جاودانی، رودادِ جہاں، پیشِ ہمّت

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ منظور شُدہ نصاب کے مطابق معیاری اور سستی کُتب مُہیا کرتا ہے۔ اگر ان کُتب میں کوئی تصور وضاحت طلب ہو، متن اور اِملا وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو گزارش ہے کہ اپنی آرا سے آگاہ فرمائیں۔ ادارہ آپ کا شکر گزار ہو گا۔

فیکس نمبر: 042-99230679
ای میل: chairman@ptb.gop.pk
ویب سائٹ: www.ptb.gop.pk

مینجنگ ڈائریکٹر
پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ
21-ای-II، گلبرگ-III، لاہور۔

Printed by: Maryah Printers Islamabad
sales@maryahprinters.com

Designed By: ART CELL PCTB